U 33026

Title - STRIKE .

Creator - Khwaja Mohd. Shafi

Publisher - Urdu Majlis Publishers Mutiya Mahal (De

Date - 1944

Pages - 150

Subjects - Urdu Adab - Afsane ; Urdu Adab - Drama .

اسٹرائک

دیگر

افسانے اور ڈرامے

از

خواجہ محمد شفیع دہلوی

ناشر:- اُردو مجلس پبلشرز ٹمیا محل دہلی

اسٹرائک

دیگر افسانے و ڈرامے

از

خواجہ محمد شفیع

فہرست

اسٹرائک

اسٹیشن پر ٹرین کھڑی ہے۔ آدمی پہ آدمی ٹوٹا پڑتا ہے تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں تل رکھنے کو جگہ کوئی صندوق پر بیٹھا ہے کوئی بستر پہ۔ کوئی لڑنے پر آمادہ۔ کوئی مرنے کو تیار پر جگہ دینے کو راضی نہیں۔ ایک موٹے سے ساہوکار دری بچھائے بستر سے ٹیکا لگائے پیر پھیلائے آدھی سیٹ گھیرے بیٹھے ہیں۔ سارے مسافر انہیں دیکھ دیکھ کر کھنسا رہے ہیں لیکن دقت یہ ہے کہ اچھے خاصے ٹھاڈے ہاتھ پیروں سے سجل دو لٹھ بند نوکران کے ساتھ ہیں کوئی دم نہیں مارتا۔ اتنے میں دو جنٹلمین سوٹ کیس لٹکائے اس ڈبہ پر آئے۔ اول تو دروازہ ہی پہ دھینگا مشتی گاؤ زوری کرنی پڑی۔ اب اندر جا کر جو دیکھا تو کہیں جگہ نظر نہیں آئی۔ یہ سیٹھ جی کی جانب متوجہ ہوئے اور ان کے دونوں بوڈی گارڈ مزاحم۔ یہ جنٹلمین بھی نرے بابو نہیں تھے سیٹھ جی کے نوکروں کو دیوار میں ٹھونس دیا۔ تھے ذلیل نسل کے۔ ٹھوکر کھا کر دُم ہلانے لگے۔ یہ دیکھ کر سیٹھ جی صاحب کی ٹانگیں سرکنی شروع ہوئیں اور ان میں سے ایک سیٹ پہ اور دوسرا موٹے مہاراج کے پیروں پہ کچھ اس طرح بیٹھا کہ ان کی چیخ نکل گئی اور پاؤں توند کے زیر سایہ پہنچ گئے۔ اب ہمارے سیٹھ جی نے اپنے شکست خوردہ نمک خواروں کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے ہارا جواری تاش کے اس پتہ پر نظر ڈالے جو وقت پہ دغا دے گیا ہو۔ اور بولے رہو پہ بستر اٹھا لے نا۔

اب کیمرہ پھرا اور فرسٹ کلاس کا پُرتکلف ڈبہ نظر آیا۔

وردی پہنے پیٹی باندھے ملازم سیٹ پہ اعلیٰ قسم کا قالین بچھا رہا ہے۔ پردوں کے تکیہ سرہانے اور بیش قیمت کمبل پائینتوں رکھ رہا ہے۔

اتنے میں ایک رئیس زادہ اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے دو بالشت کا فیشن کا ڈنڈا بغل میں دبائے سر پہ ہیٹ لگائے ایک ہاتھ میں ۹۹۹ کا ٹین لئے نہایت ٹھاٹھ سے تشریف لائے۔

ڈبہ میں داخل ہو کر نوکر سے دریافت کیا سب ٹھیک ہے؟ اس نے کہا جی حضور۔ بولے، اچھا تم سرونٹس میں جاؤ۔ اور خود پلیٹ فارم پر اتر کھڑے ہوئے اتنے میں میگزینز بیچنے والا آیا۔ جناب نے کچھ انگریزی کی اور کچھ اردو کی خرید فرمائیں۔ پانچ کا نوٹ اسے دیا۔ وہ ایک روپیہ کچھ آنے واپس کرنے لگا سرکار نے وہ اس ہی کو بخشش

کر دیا۔ وہ سلام کر کے سیدھا ہولیا۔

اتنے میں ایک جوان خوبصورت لڑکی کئی کی ساڑی باندھے قلی کے ساتھ ساتھ گھبرائی، بوکھلائی تھرڈ کلاس کے زنانہ درجہ پر پہنچی۔ یہاں قیامتِ صغریٰ بپا تھی۔ نفسا نفسی کا عالم۔ دروازہ کا کھلنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس کے پیچھے نہ صرف سامان کے ڈھیر تھے بلکہ انسانوں کے انبار بھی لگے تھے۔ نیز پانچ سات درجن عورتیں اندر قلعہ بند ہوئی بیٹھی تھیں۔ اس نو وارد کو دور سے آتا دیکھ کر فوج کی فوج کھڑکیوں پر آن جمی۔ یہ ان کے دمدمہ تھے اور چشم ہائے خشم آلود سے تیر برسانے شروع کئے۔ جب دشمن قریب تر آیا تو بدکلامیوں کا ایک گراب برسایا۔ حملہ آور تیورا گئی، پر ہمت نہ ہاری۔ اڑی کھڑی رہی۔ لیکن یہ اکیلا چنا سورما بھی سہی بھاڑ کو کیا پھوڑ سکتا تھا۔ یہ زنانِ تیغ زبان اب گرم گفتار ہو چکی تھیں۔۔۔۔۔ گارڈ دوسری سیٹی دے رہا تھا کہ ہمارے حملہ آور یکہ سپاہی نے آخری وار کیا اور کھڑکی کے راستہ ہراول کے طور پر اپنا اٹیچی کیس داخل کرنا چاہا۔ سنگ دلوں نے اسے ہاتھوں کی سنگینوں پر باہر ہی روکا۔ کوشش ناکام گئی۔ اٹیچی کیس ٹرین کے نیچے گرا۔ گاڑی چلنی شروع ہوئی۔

ہمارے فیشن ایبل چھیلا منہ میں سگرٹ لگائے اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی ماں کی جائی آج جانے کی ٹھان چکی تھی۔ ان کا دروازہ کھلا دیکھ کر اوپر چڑھ آئی۔ کچھ انہوں نے بھی مدد کی۔ قلی نے سامان اندر پھینک دیا۔ اب قلی پیسوں کے لئے لپکا چلا آرہا ہے۔ اور محترمہ جیبیں ٹٹول رہی ہیں کہ صاحب بہادر نے جیب میں سے ایک روپیہ نکال باہر پھینک دیا۔ اب ٹرین پلیٹ فارم سے گذر چکی تھی اور ان ہم قفس پرندوں نے آنکھیں بچا بچا کر ایک دوسرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جنٹلمین نے سامنے کی خالی سیٹ پر بیگم کا بستر رکھا اور سوٹ کیس ایک طرف لگا دیا۔ اب ایک میگزین تو خود لے لی اور باقی ان کے سامنے رکھ کر خموش ہو بیٹھے۔ موجودہ تہذیب بغیر باقاعدہ تعارف کے انسان کو انسان سے بات کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

تھوڑی دیر بعد ڈائننگ کا بوئے کھانے کی بابت دریافت کرنے آیا۔ بولا "ڈنر ڈبہ میں لیگا یا سیلون میں" صاحب بولا "سیلون میں"۔ بوئے نے کہا "اور بیگم صاحب"؟ اس سوال پر بیگم کے جسم کو قدرے جنبش ہوئی لیکن زبان کو نہیں۔ صاحب بہادر نے سر کھجایا اور فرمایا "اچھا دو ڈنر ادھر لے آنا"۔

بوئے کا جانا اور بیگم صاحبہ کو غصہ آنا۔ بولیں "آپ نے میرے لئے کھانا کیوں منگایا ہے"۔ مرد نے نہایت

شرافت اور انسانیت سے جواب دیا۔" کیا عرض کروں۔ ڈنر ٹائم ہونے والا ہے۔" یہ بولیں "میں نہیں کھاؤں گی۔"
وہ بولا "کیا مضائقہ ہے رکھا رہے گا۔"

اس پر تو وہ آگ بگولا ہو گئی۔ بولی "آپ امیروں کو رزق کی قدر نہیں۔ روپیہ کی قیمت نہیں معلوم۔ ڈنر ٹائم ہو گیا تو ڈنر آنا لازمی۔ کوئی کھائے یا نہ کھائے۔ آج دنیا میں لاکھوں بندگانِ خدا بھوکے مر رہے ہیں۔ کسی کا بچہ دودھ کو بلک رہا ہے کوئی مریض سنگترے کے عرق کو۔ ٹھیرے رہیئے یہ کچھ دن کے دھندے ہیں۔ یہ تفوق اب زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ دولت کا غیر متناسب بٹوارہ ختم کر دیا جائیگا۔ امتیازات اُٹھا دیئے جائیں گے۔ ذرا مزدور کی آنکھ کھل جانے دیجئے۔"

ہمارا ہیرو نہایت اطمینان خاطر کے ساتھ یہ سب سنتا رہا جب وہ چپ ہوئیں تو بولا "کیا آپ سوشلسٹ ہیں؟"

لڑکی نے جواب دیا "جی ہاں سوشلسٹ امیروں کی دشمن۔ غریبوں کی ہمدرد۔ مزدوروں کو بھوکا مار کر ڈنر کھانے والوں کی دشمن۔"

بیگم کی زبان پر یہ آخری جملہ تھا جو بوئے ڈنر لے کر آیا۔ اور اس فقرہ سے کچھ ایسا گھبرایا کہ اگر ہمارا ڈنر پرست ہیرو ٹرے نہ سنبھال لیتا تو رزق خاک میں مل ہی گیا ہوتا۔

بوئے نے نہایت تہذیب کے ساتھ کہا

EXCUSE ME SIR

جنٹلمین نے کہا IT IS ALL RIGHT

بوئے نے قرینہ سے میز پر ڈنر لگایا اور جاتے ہوئے پوچھا "حضور کیا پئیں گے؟"

لڑکا بولا "پانی۔"

بوئے :- اور بیگم صاحب؟

لڑکا :- برف کا پانی۔

بوئے کے چلے جانے کے بعد لڑکی بگڑ کر بولی "یہ آپ نے کیا تماشا بنا رکھا ہے۔" ہیرو نے نہایت معصومانہ انداز میں جواب دیا "خدا گواہ ہے میں بالکل بے قصور ہوں۔"

اتنے میں بوئے برف کے پانی کا جگ اور دو گلاس لے کر آن پہنچا۔ میز کے ایک کونے پر جگ رکھ کر بولا "حضور پڈنگ کھائیں گے؟ سیلاڈ؟" لڑکے نے جواب دیا "سیلاڈ"
اس نے کہا "اور بیگم صاحب؟" ——— اب ہماری جھلوسولی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ بگڑ کر بولیں "یہ تم بیگم صاحب بیگم صاحب کیا کرتا ہے؟" بوئے نے سر جھکایا اور کہا "I beg your pardon میم صاحب۔"

ہیرو بولا "دیکھو مس صاحب پڈنگ کھائیں گی۔"
بوئے ایک ڈش سیلاڈ کی اور ایک پڈنگ کی لیکر

آیا۔ لڑکے نے باہر ہی سے لے لیں کہ مبادا کوئی اور بات
نہ نکل آئے۔

اب میز کے قریب جا کر اس نے ڈشز کے کور کھولنے
شروع کئے اور بولا "ابھی تو گرم گرم ہے۔ کھا لیجئے۔ ٹھنڈا
ہو کر بے کار ہو جائے گا۔"

مس صاحب نے جواب نہ دیا۔ اور اس طرف سے
میگزین کی آڑ کر لی ـــــ اب ہیرو نے مزے
لے لے کر چکھم چکھا شروع کی اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا۔

"یہ تلی ہوئی مچھلی ہے۔ صبح سویرے کڑکڑاتے جاڑے
میں غریب مچھل ہارا اپنے بچوں کو سوتا چھوڑ گھٹنوں گھٹنوں
یخ پانی میں جا کر اسے پکڑ کر لایا۔ دکاندار کے ہاتھ بیچی۔
وہاں سے ہوٹل کے ملازم نے خریدی۔ باورچی نے پکائی۔
بیرے ہم تک لایا ـــــ گھونگٹ والی جاٹنی نے
سویرے ہی سویرے دودھ دوہا۔ دہی بلویا۔ گھی بنایا
اور وہ شہر میں بکا۔ ہوٹل کے باورچی خانہ تک آیا۔ پھر اس
میں مچھلی تلی گئی۔ اب اگر اسے پیسے والے کھانا چھوڑ دیں تو
مچھل ہارے کے بچے فاقہ مر جائیں۔ جاٹنی کی بھینسیں بک
جائیں۔ دوکاندار کا دیوالہ نکل جائے۔ ہوٹل کا عملہ نوکری
سے برخاست کر دیا جائے۔ پس میں اسے کھانے میں نہ
صرف اپنا پیٹ بھر رہا ہوں بلکہ سینکڑوں غریبوں
کا بھی پیٹ پال رہا ہوں۔"

اس اشتہا انگیز تمہید کے بعد اس نے ایک ٹکڑا
منہ میں رکھا اور بولا "خوب بنائی ہے۔ اور ٹماٹو سوس کے
ساتھ تو عجب مزا دے رہی ہے ـــــ یہ مٹن چوپس تو
ظالم نے غضب کے تیار کئے ہیں ـــــ اُف حلق میں
اٹکتے ہیں۔ انسان بڑا بے درد ہے۔ لذّت طعام کے لئے
لاکھوں کی جان لیتا ہے۔ بیچارے بے زبان بکرے کے
پارچے کر کے مزے لے لے کر کھاتا ہے ـــــ یہ
لطیف جذبہ آج مجھ میں پہلی دفعہ پیدا ہوا ہے۔ شاید کسی
کا روحانی تصرّف ہے ـــــ بائیں جانب کچھ
کسک سی بھی ہے۔ یہ شاید جسمانی تصرّف ہے ـــــ
تو کیا یہ چوپس یونہی پڑے رہیں گے۔ بکرا تو بہر صورت
جان سے گیا۔ اب میرے نہ کھانے سے وہ تو زندہ ہو
نہیں سکتا اور اگر میں نہ کھاؤں گا تو بھوک سے مر جاؤں گا۔
اور ایک کے بدلہ دو کی جان جائے گی۔"

اب لڑکی نے سامنے سے میگزین ہٹائی۔ نیلے پیلے
دیدوں سے ہیرو کو دیکھا اور کہا "جلدی کھا لیجئے کہیں
بھوک سے دم نہ نکل جائے۔"

لڑکا :۔ اچھا تو آپ کی رائے یہی ہے تو پھر اس کار خیر
میں شریک کیوں نہ ہو جایئے۔ یاد رکھیئے خودکشی حرام
ہے۔ اور نہ کھانے سے آدمی کا مر جانا لازمی۔"

لڑکی نے نہایت طنز آمیز لہجہ میں کہا "بیشک انسان

اُن کا کیڑا ہے اسی واسطے اُسے پیٹ کا کُتا کہا گیا ہے۔"

لڑکا:۔ "نہایت خوب خطاب ہے ماشاءاللہ۔ کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ رزق دینے والے ہاتھ کو پہچانتا ہے۔"

مس صاحبہ اس پر بگڑ گئیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ بولیں "رزق دینے والا ہاتھ۔ رزق دینے والا ہاتھ۔ امیروں کی اصطلاحیں۔ رئیسوں کے خوشنما جملے۔ غلط ذہنیت کی اختراعیں۔ غلامی زدہ دماغوں کی تراشیں۔ کوئی کسی کو رزق نہیں دے سکتا۔ یہ سب بکواس ہے لہو چوسنے والے اپنے کو رزاق تصور کرتے ہیں۔ مجھے ان امیروں کی صورت سے نفرت ہے۔ اب بھی ایک سوئے کے پجاری کی دنیا اُلٹنے جا رہی ہوں۔"

لڑکا:۔ "یہ کام تو آپ اب بھی کر رہی ہیں۔ بہرکیف وہ ایسا کون سا خوش بخت ہے جس کی دنیا آپ بالارادہ اُلٹنا چاہتی ہیں؟"

لڑکی:۔ ایک سرمایہ دار مل اونر۔ سر احمد کریم۔ مزدوروں کی محنت پر عیش کرنے والا۔"

(یہ نام سنکر لڑکے کے ماتھے پر ایک شکن پڑی لیکن خموشی سے سنتا رہا)

لڑکی:۔ "انتہائی آوارہ۔ عیاش۔ آپ اسے جانتے ہیں؟"

لڑکا:۔ "جی ہاں۔ کچھ یوں ہی سا۔"

لڑکی:۔ "کہتے ہیں کہ ایک ایک رات میں اس کا ہوٹل کا بل چار چار ہزار روپیہ کا ہو جاتا ہے۔"

لڑکا:۔ "ممکن تو ہے۔"

لڑکی:۔ "جی ہاں ممکن کیسے نہ ہوگا۔ جب شرابیں پانی کی طرح بہیں گی تو آپ سے آپ بل ہزاروں تک جانا ہے۔ اگر میاں کو خود صبح سے شام تک مشین چلانی پڑے تو پتہ چلے۔"

لڑکا:۔ "لیکن شراب تو وہ نہیں پیتا۔"

لڑکی:۔ "پھر بل ایک ایک رات کا اتنا بڑا کس طرح ہو جاتا ہے؟"

لڑکا:۔ "کیا عرض کروں آپ شاید واقف نہیں۔ آج کل اچھا ڈنر دس روپے پر ہیڈ (per head) پڑ جاتا ہے۔ سو اگر چار سو مہمان بلائے تو چار ہزار کا بل بن جانا کوئی تعجب خیز چیز نہیں۔"

لڑکی:۔ "مفت کا آتا ہے نا۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ گھر بیٹھے رقمیں مروڑتے ہیں ان کے لئے چار چار سو مہمان بُلا لینے کون سی بڑی بات ہے۔"

لڑکا:۔ "بعض اوقات بزنس کے لئے بھی ڈنرز دینے ضروری ہوتے ہیں۔"

لڑکی:۔ "بزنس۔ مزدور کا گلا کاٹنا۔ زیادہ سے زیادہ کام لینا۔ کم از کم اُجرت دینا۔ انسان کو جانور کی طرح استعمال کرنا۔ پیسے کی چیز کا روپیہ وصول کرنا۔

اسی کا نام اگر بزنس ہے تو اس ہی بزنس کی جڑیں اکھڑنے میں جارہی ہوں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں مزدور اب تنگ آگئے ہیں اور مسٹر احمد کریم کی ملز میں اسٹرائک ہوگئی ہے۔"

اس فقرہ پر لڑکے کے چہرہ پر فکر کے آثار نمایاں ہوئے اور اس نے کہا۔ "کتنے عرصہ سے؟"

لڑکی: "آج چار روز ہوگئے مزدور کام پر نہیں جارہے مجھے بذریعہ تار بلایا گیا ہے۔ میاں کی عقل ٹھکانے لگادوں گی۔ مجھے امیروں کی شکل سے نفرت ہے۔"

(وہ اتنا کہہ کر خموش ہوگئی۔ لڑکے نے پھر کہا)

لڑکا: "آپ کھانا تو کھا لیجئے۔"

لڑکی: "جناب آپ کو معلوم ہوجانا چاہیئے کہ مجھے امیروں کی اغذیا سے بھی دلی تنفر ہے۔ غریبوں سے ہمدردی پیدا کرنے کے لئے آج پورا ایک مہینہ ہونے آیا کہ میں نے سوائے چٹنی روٹی کے اور کچھ نہیں کھایا ہے۔"

لڑکا: "کیا مضائقہ ہے۔ آپ ٹمیٹو سوس اور ڈبل روٹی ہی سے شوق فرمائیں۔"

لڑکی: "جناب کو معلوم ہوجانا چاہیئے کہ مجھے امیروں سے بات کرنی بھی گوارا نہیں۔ محض اتفاق سے میں اس ڈبہ میں آگئی ہوں۔ اگلے سٹیشن تک اپنی زبان مبارک کو آرام دے لیں تو کرم ہوگا۔ وعدہ کرتی ہوں کہ اسکے بعد میں آپ کی ہم سفر نہیں رہوں گی اور اپنی غریب بہنوں کے ساتھ تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں جا بیٹھوں گی۔"

یہ فقرہ سنکر لڑکے نے خموشی اختیار کی اور آہستہ آہستہ پوٹیٹو چپس کھاتا رہا۔ اتنے میں سٹیشن آیا اور لڑکی اس ماحول پر ایک نفرت آمیز نظر ڈالتی ہوئی ڈبہ میں سے اُتر ی ——— تھرڈ کلاس کی خواتین نے جواب تک قلعہ بنا ہوئی بیٹھی تھیں اب اپنے کو حملہ آوروں سے مامون خیال کرکے دروازہ کھول لیا تھا اور ایک نہایت فربہ اندام محترمہ کھڑی تیل کے دال سیو خرید رہی تھیں۔ ہماری مس صاحب اُن کے پیٹ پر ذراسا دباؤ ڈالتی ہوئی ڈبہ میں داخل ہوگئیں۔ قریب کی سیٹ پر ایک صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ خوبیٔ قسمت سے ان کی کہنی پر ایک ذراسا دانہ تھا اسے ٹھیس لگ گئی اور وہ گلا پھاڑ کر چیخیں ۔ مس صاحبہ جو گھبرا کر پرے کو سرکیں تو دائیں جانب کسی کا تین سالہ بچّہ کھڑا تھا اس کی ناک پر ان کا گھٹنا لگا اور کم بخت کی نکسیر پھوٹنے لگی۔ اتنے میں ریل چل پڑی ——— ہم نہیں کہہ سکتے کہ ڈبہ میں کیا گذری۔ اس لئے کہ کیمرے کا رُخ پھر گیا اور پھر فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ آنکھوں کے سامنے آگیا۔ برابر کے ڈبہ میں سے چیخ پکار کی آوازیں آرہی تھیں اور ہمارا ہیرو سخت مضطرب و پریشان ٹہل رہا تھا۔

خداخدا کرکے سٹیشن آیا۔ ابھی ریل پوری طرح رُکی بھی نہ تھی اور ہمارا ہیرو دروازہ کھول رہا تھا کہ غربت کی دلدادہ لیڈرانی صاحبہ بحال تباہ مثل آدم وحوا جنّت الغربا سے خارج کردی گئیں —— لڑکے نے یہ منظر دیکھا اور دروازہ کھول ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ محترمہ نہایت جزبز پھر اسی کمپارٹمنٹ میں تشریف لے آئیں اور لڑکے نے دروازہ بند کر کھڑکی میں سے باہر منہ نکال دیا لیکن تماشہ کنکھیوں سے دیکھتا رہا —— بیگم نے پہلے تو بالوں پر ہاتھ پھیرا پھر اپنی خون آلود ساڑھی پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد سوٹ کیس کھول کر کپڑے نکالے اب ادھر اُدھر ٹٹولنا شروع کیا۔ کبھی ہاتھوں سے بالوں کو درست کریں، کبھی سوٹ کیس کی جیبوں میں کچھ تلاش کریں ہیرو تاڑ گیا کہ کنگھا بُرش ڈھونڈا جارہا ہے —— اُس نے نہایت خموشی سے اپنا ڈریسنگ کیس اٹھایا اور کھول کر ٹوئلٹ میں رکھ آیا۔ اور پھر کھڑکی کے باہر مُنہ نکال یہ گیت ذرا آواز سے گانے لگا۔

گوری کنگھا بُرش تیار ہے
گوری کنگھا بُرش تیار ہے
تیرے جوبن پہ آئی بہار ہے
گوری کنگھا برش تیار ہے
تیرے ریشم سے بال۔ تیرے گورے گورے گال
تیری قمری سی چال۔ مورا جیا نثار ہے
گوری کنگھا بُرش تیار ہے

بس صاحبہ نے لڑکے کی طرف تیکھی چتون سے دیکھا اور اپنے کپڑے بغل میں مار ٹوئلٹ میں داخل ہوگئیں۔

لڑکا اتنے ایک غزل گاتا رہا —— اب یہ بیگم منہ ہاتھ دھو صاف ستھری ہو برآمد ہوئیں اور چہرہ پر بھی قدرے تکدّر کم تھا۔ لڑکے کا ڈریسنگ کیس سیٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "Thank you"۔ اس نے گردن جھکا کر کہا۔ "It is all right"۔ نیز محترمہ کی اس موڈ کو غنیمت سمجھ کر بولا۔ "میں سمجھتا ہوں آپ بمبئی پہنچتے ہی تقریر فرمائیں گی؟"

لڑکی :۔ جی ہاں۔

لڑکا :۔ لیکن اگر آپ رات کو آرام سے نہ سوئیں تو صبح دماغ تھکا ہوا ہوگا۔

لڑکی :۔ یہی میں سوچ رہی ہوں۔

لڑکا :۔ اچھا تو میری ایک عرض قبول کرلیں۔ از راہِ مہربانی تھوڑا سا کھانا ضرور ملاحظہ فرمالیں تاکہ نیند اچھی آئے۔

لڑکی :۔ مہربانی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔

لڑکا :۔ دیکھئے آپ جس کام کو جارہی ہیں وہ آپ کو عزیز ہے؟

لڑکی :۔ بیشک ۔
لڑکا :۔ اچھّا تو اب یہ بتائیے کہ مزدوروں پر آپ اپنی تقریر ہی سے تو اثر ڈال سکتی ہیں کہ وہ کام پر نہ جائیں تمام دقتیں برداشت کرلیں۔ پر اپنی بات سے نہ ٹلیں۔ جان پر کھیل جائیں لیکن مطالبات منظور کراکے رہیں ۔
لڑکی :۔ یقیناً ۔
لڑکا :۔ اچھّا تو اب یہ خیال کیجئے کہ اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے آپ کی تقریر کمزور رہ گئی اور ان کے جذبات میں آگ نہ لگا سکی تو پھر آپ اپنی مشن میں ناکام رہیں گی۔ میں اسی لئے عرض کر رہا ہوں کہ کچھ کھالیں۔ پھر آرام سے سو جائیں۔ تاکہ صبح تازہ دم اُٹھیں اور اپنے کام کو حسن وخوبی انجام دے سکیں یقین جانئے میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس مل کے معاملات انصاف اور ایمان داری سے طے پا جائیں ۔
لڑکی :۔ لیکن میں تو صرف چٹنی روٹی کھاتی ہوں ۔
لڑکا :۔ اس کا بھی انتظام ہے۔ دیکھئے اس بوتل پر چٹنی لکھا ہوا ہے اور یہ ڈبل روٹی حاضر ہے۔ اگر آپ کو اسی پر اصرار ہے تو یہی سہی لیکن کچھ کھا تو لیجئے ۔
لڑکی :۔ بہت اچھّا۔
اب لڑکی نے چٹنی روٹی کھانی شروع کی اور لڑکا بھی انہیں چیزوں میں ساتھ دیتا رہا۔ باقی ڈشیں سامنے رکھی رہیں ۔

لڑکی :۔ آپ یہ چیزیں کیوں نہیں کھاتے ؟
لڑکا :۔ کچھ بھلا نہیں لگتا ۔
لڑکی :۔ تو کیا یہ یونہی پڑی رہیں گی۔ ضائع جائیں گی ۔
لڑکا :۔ کیا عرض کروں۔ سچ یہ ہے کہ ان کے ضائع جانے کا تو اتنا احساس مجھے نہیں ہاں یہ ڈرتا ہوں کہ رزق سامنے رکھا رہے اور آدمی اسے نہ کھائے تو سنا ہے یہ خدا کو بُرا لگتا ہے اور اس سے رزق چھین لیا جاتا ہے اس لئے کہ یہ کفران نعمت ہوا۔ بہر نوع جو مقدر میں ہے سو ہو کر رہے گا لیکن مجھ سے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ چٹنی روٹی کھائیں اور میں مٹن چوپس ۔
لڑکی :۔ آپ کے خیالات اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے حق نہیں کہ آپ کو کسی ایسی حرکت پر مجبور کروں جو آپ اچھی نہ سمجھیں ــــــ خیر بحالت مجبوری ۔
لڑکا :۔ میری خاطر سے ۔
یہ کہہ کر اس نے چوپس کی طشتری سامنے کی اب سلسلہ شروع ہو گیا منہ کے ساتھ ساتھ زبان بھی حرکت میں آئی ۔
لڑکی :۔ اجازت دیجئے کہ میں ایک بار پھر جناب کے کنگھے برش کا شکریہ ادا کروں لیکن مجھے تعجب یہ ہے کہ آپ سمجھے کیونکر کہ مجھے ان چیزوں کی تلاش ہے ۔
لڑکا :۔ بندہ نواز! عورت اس بیتابی سے سوائے سنگار کی چیزوں کے اور کوئی چیز تلاش نہیں کرتی ۔

غرض کہ ان محترمہ نے کھانے کے دوران میں ہمارے ہیرو کو بتا دیا کہ ان کا نہ صرف سنگار کا سامان اس اٹیچی کیس میں تھا جو سٹیشن پر گر گیا بلکہ ٹکٹ اور روپیہ پیسہ بھی سب اسی میں تھا۔ اگلے سٹیشن پر لڑکے نے گارڈ کو ایک فرسٹ کلاس ٹکٹ کا کرایہ ادا کر دیا اور اب یہ دونوں آرام سے بیٹھ کر باتیں بنانے لگے۔

لڑکا :۔ معاف کیجئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب آپ سو جائیں تاکہ صبح دماغ تازہ ہو اور آپ اچھی طرح تقریر کر سکیں۔ آپ نے تقریر تو تیار کر لی ہو گی۔

لڑکی :۔ میں تو پہلے سے کبھی تقریر تیار نہیں کرتی۔

لڑکا :۔ تعجب ہے۔

لڑکی :۔ کیوں؟

لڑکا :۔ میں نے اوکسفورڈ سے فن تقریر میں سَنَد لی ہے اور ہم کو سب سے پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ کبھی کسی جلسے میں تقریر تیار کئے بغیر بولنے کو مت کھڑے ہونا۔ نیز گاندھی جی کو دادا بھائی نیرو جی نے بھی یہی ہدایت کی تھی جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

لڑکی :۔ صاحب میں تو ہمیشہ یوں ہی بولنے کھڑی ہو جاتی ہوں جس طرح خیالات آتے جاتے ہیں سامعین کے سامنے پیش کرتی جاتی ہوں۔

لڑکا :۔ یہ صحیح ہے کہ دوران تقریر میں جو خیالات حسب موقع آئیں انہیں روکنا نہیں چاہیئے۔ ورنہ تقریر میں روانی کم ہو جاتی ہے۔ لیکن اصل تقریر پہلے سے تیار ہونی چاہیئے اور اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتی ہیں تو اسی اصول پر کاربند ہو جائیے۔

لڑکی :۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے تو صبح وہاں پہنچتے ہی بولنا ہو گا اور میری اس تقریر کے نتیجہ پر دنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔

لڑکا :۔ اگر آپ کوئی مضائقہ نہ سمجھیں تو بولنا شروع کریں میں سنتا رہوں گا تقریر تیار ہو جائے گی۔

لڑکی :۔ لیکن آپ کو جو تکلیف ہو گی۔

لڑکا :۔ آپ اس کی پرواہ نہ کیجئے۔ میں آپ کی کامیابی میں بیش از بیش دلچسپی رکھتا ہوں اور اس کام کو اپنا ہی کام سمجھتا ہوں۔

غرضکہ ذرا حیل حجت کے بعد لڑکی نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی۔

لڑکی :۔ بھائیو! تم نے آج کے جلسہ میں بُلا کر میری عزّت افزائی کی ہے۔ یقین جانو مجھے تم سب ایسے ہی عزیز ہو جیسے میرے سگے بھائی۔ سرمایہ داروں نے تمہاری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ محنت تم کرتے ہو پھل وہ پاتے ہیں۔ تم جھونپڑیوں میں گذر بسر کر رہے ہو وہ محلوں میں عیش منا رہے ہیں۔ تمہاری محنت سے جو

مال حاصل کیا جاتا ہے اس کا ایک لاکھواں حصہ بھی
تمہارے حصہ میں نہیں آتا۔ روس میں مزدور اُٹھے
انہوں نے سرمایہ داری کو ختم کر دیا۔ اب وہاں امیر غریب
کا فرق باقی نہیں۔ سب ایک حال میں ہیں۔ خدا کا
شکر ہے کہ ہمارے ملک کے مزدوروں کو بھی اپنے حقوق
طلب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن میری تم سے استدعا ہے
کہ جب اس کام میں کھڑے ہوئے ہو تو آخر تک پہنچا
دینا۔ انسان یا تو کوئی کام کرے نہیں اور کرے تو
تنت تک پہنچائے۔

لڑکی یہاں تک پہنچی تھی کہ لڑکے نے ڈرسنگ کیس
کھول ناخن کترنے شروع کر دیئے۔ وہ رُک گئی۔

لڑکا:۔ ہاں آگے۔

لڑکی:۔ میرا مطلب ــــ میں آپ لوگوں
سے کہنا چاہتی ہوں ــــ میرا مدعا ہے کہ ــــ
(اتنا کہہ کر آگے نہ چل سکی۔ لڑکا برابر ناخن کترتا رہا)

لڑکا:۔ آپ خموش کیوں ہو گئیں؟

لڑکی:۔ آپ سُن تو رہے نہیں۔

لڑکا:۔ محترمہ! آپ کے سامنے جو دو چار ہزار کا مجمع
ہو گا کیا آپ یہ توقع رکھتی ہیں کہ وہ سب ہمہ تن گوش
مٹی کی مورتیاں بنے بیٹھے رہیں گے۔ ایک کھانسے گا
ایک چھینکے گا۔ ایک ٹوپی اتار کر اپنا گنجا سر کھجائے گا۔
دوسرا اس پر مُسکرائے گا۔ تیسرا اسے چُپ رہنے کی
ہدایت فرمائے گا۔ ایک آپ کے رُخِ روشن کو گھوریگا
اور برابر والے کو کہنی مارے گا۔ ایک آئیگا، ایک جائیگا۔
کسی کا بچہ روئے گا۔ کسی کا پیر سُن ہو جائیگا وہ اُسے
آہستہ آہستہ دبائے گا۔ یقین جانئے بعض اونگھ جائینگے
برابر والے ان کو ٹہوک ٹہوک کر جگائیں گے ــــ
اگر اتنی سی بات پر آپ رُک گئیں اور آپکے خیالات
کی ریل پٹری سے اتر گئی تو جب یہ سب بیتے گی تو
آپ تقریر کا توازن اسکی روانی اور Tempo
کس طرح قائم رکھ سکیں گی۔ میں نے تو جان کر ناخن
کترنے شروع کئے تھے تاکہ آپ کے دماغی رُجحان
یکسوئی کا امتحان کروں۔ نیز ہم کو کالج میں اسی طرح
مشق کرائی جاتی ہے۔ جلسہ میں ہر نیا واقعہ مقرر کو موقع
دیتا ہے کہ وہ اس سے اپنی تقریر کو اُبھار کر لے جائے
جلسہ میں ہر غیر متوقع بات مقرر کے لئے ایک پیغام لاتی
ہے۔ کامل فن اُس سے فائدہ اُٹھا لیتا ہے متوسط مقرر
اسے نظر انداز کر جاتا ہے اور گھٹیا توازنِ دماغی ہاتھ
سے دے دیتا ہے۔

لڑکی:۔ اچھا یہ فرمایئے کہ میری تقریر کے اس ٹکڑے
کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟

لڑکا:۔ صحیح صحیح عرض کروں۔

لڑکی :۔ بیشک۔

لڑکا :۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گی ؟

لڑکی :۔ ہرگز نہیں۔

لڑکا :۔ اگر آپ اسی طرز پر چلیں تو یقین جانیئے اسٹرائک جاری نہیں رہ سکے گی۔ آپ کی تقریر میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو مزدوروں میں آگ لگا دیتی۔ انہیں بھڑکا دیتی۔ ان کی دُکھتی رگ دبا کر تڑپا دیتی۔ نیز ایک چیز اور یاد رکھیئے اگر شروع میں آپ جلسہ پر چھا جائینگی تو بیچ میں ذرا اگر گر بھی اُبھر سکتی ہیں اور جو ابتدا ہی میں تقریر پھُسپھُسی رہ گئی تو پھر مجمع کو اپنی جانب متوجہ کرنا امکان میں نہیں رہتا۔

لڑکی :۔ اچھا تو پھر میری تقریر میں کیا خامی تھی ؟

لڑکا :۔ آپ ناراض تو نہیں ہوں گی ؟

لڑکی :۔ اطمینان رکھیئے۔

لڑکا :۔ آپ نے ابتدا ہی غلط لفظ سے کی تھی۔ ہر تیسرے درجہ کا مقرر "بھائیو" ہی کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ سامعین اس کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ ان کے دماغ سو جاتے ہیں۔ تخاطب ان الفاظ سے ہونا چاہیئے جن کے لئے وہ تیار نہ ہوں تاکہ جاگ اُٹھیں سُننے اور سمجھنے کا شوق ان میں پیدا ہو جائے۔ یاد رکھیئے آپ کی تقریر کی بنیاد پہلے الفاظ پر ہوتی ہے۔ آپ کو آگے جو عمارت بنانی ہے بنا اسکے مطابق ڈالیئے تو پھر دیواریں خود بخود اٹھتی چلی جائینگی ورنہ عمارت کڈھب ہو جائے گی۔ اور نیو کمزور رہجائیگی عام دیکھنے والے یہ تو نہ بتا سکیں گے کہ عمارت میں عیب کیا ہے لیکن نظر فریب نہ ہو گی اسی طرح اگر تقریر کا پہلا لفظ ساری تقریر کے مناسب نہیں اور خطاب ہی ناموزوں الفاظ میں ہو گیا تو سننے والے اثر لے کر نہیں جائیں گے۔

لڑکی :۔ اچھا تو آپ کیونکر شروع کرتے ؟

لڑکا :۔ مجھے مشق نہیں رہی۔ ہاں کچھ اصول یاد ہیں جو عرض کر دیئے۔

لڑکی :۔ پھر بھی۔

غرض کہ لڑکی کے اصرار پر لڑکا کھڑا ہوا اور یوں بولنا شروع کیا۔

لڑکا :۔ آگ اور لوہے سے کھیلنے والے مزدورو ! فولاد کو پانی کر کے بہا دینے والے جوانو ! آج میں تم کو خوش خبری دینے آئی ہوں۔ تمہارے دلوں کی دہاڑ سنکر پتھر کے پتّے پانی ہوتے جا رہے ہیں۔ سنگ دل اپنی جگہ تھرا رہے ہیں۔ سرمایہ داری کی سر بفلک عمارت لرزہ براندام ہے۔ استبداد کا جھنڈا جھک گیا ہے۔ ظالم مظلوم کے قدموں پر جھکنے کو ہے۔ دولت محنت

کے دربار میں حاضر ہوا چاہتی ہے۔ محنت مہارانی کا دربار جما ہوا ہے۔ اب لاج تمہارے ہاتھ ہے اور میں جانتی ہوں کہ تم لاج کے رکھنے والے ہو۔ یاد رکھو تمام عالم کی نظریں تم پر جمی ہیں۔ دنیا تمہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ ایک بھاری بوجھ تمہارے کندھوں پہ ہے۔ لیکن یہ مزدور کے کندھے ہیں جو جھک نہیں سکتے ———— یاد رکھو اگر اس وقت ایک قدم ہٹ گئے تو تمہاری اولاد تمہیں کوسے گی۔ آنے والی نسلیں تمہاری قبروں پر لعنت بھیجیں گی۔ یہ جنگ تم اپنے لئے نہیں لڑ رہے معصوم اولاد کے لئے لڑ رہے ہو ———— تم جون جولائی کی گرمی میں جب آسمان سے آگ برستی ہے اور زمین تانبے کی طرح تپتی ہے اپنے کو بھٹیوں میں کس کے لئے جھونکتے ہو۔

لڑکی :۔ (بے ساختہ) اولاد کے لئے۔

لڑکا :۔ تم برفانی جاڑے میں ٹھنڈے یخ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر انجنوں کی پیاس بجھاتے ہو کس کے لئے؟

لڑکی :۔ اولاد کے لئے۔

لڑکا :۔ وہی اولاد جس کے لئے تم یہ سارے پاپڑ بیلتے ہو آج تم سے کہہ رہی ہے کہ پتا جی پیچھے نہ ہٹنا ———— فرض کرو ایک درندہ تمہاری طرف بڑھ رہا ہے۔ اور تمہارا بچہ تمہاری گود میں ہے۔ کیا تم بچے کو آگے کر دو گے؟

لڑکی :۔ ہرگز نہیں۔

لڑکا :۔ خود آگے بڑھ جاؤ گے۔

لڑکی :۔ بیشک۔

لڑکا :۔ اب میں ان ماؤں سے پوچھتی ہوں جو میرے بائیں ہاتھ بیٹھی ہیں جن میں سے اکثر اپنے لعلوں کو سینے سے لگائے بیٹھی ہیں جو خود گیلے میں سوئیں اور بچوں کو سوکھے میں سلایا۔ فرض کیجئے آگ بھڑک رہی ہے آپ اپنی ممتا کو گود میں لئے کھڑی ہیں سینوں پر ہاتھ رکھ کر بتایئے۔ آپ بچے کو آگ سے دور رکھیں گی یا اپنے کو۔

لڑکی :۔ بچے کو۔

لڑکا :۔ بس تو سمجھ لیجئے کہ اس وقت بھی دنیا میں آگ بھڑک رہی ہے اب اس میں چاہے اپنے بچوں کو جھونک دیجئے چاہے خود کود جایئے ———— اگر آپ اس وقت ان شعلوں سے گھبرا اٹھے تو یاد رکھیئے نہ صرف یہ آگ آپکی موجودہ اولاد کو جھلس دے گی بلکہ آپ کے پوتوں اور پڑپوتوں کو خاک سیاہ کر دیگی۔ اور آپ بھی اس کی لپٹ سے بچ نہیں سکیں گے۔ یہ آزمائش کا وقت ہے ۔ کندن کا کس دیے جایئے منزل دور نہیں۔ یہ مزدور کے قدم ہیں۔ ابھر کے نہیں منزل سے ورے رک نہیں سکتے۔

لڑکی جواب تک بیخودی کے عالم میں ساکت و جامد بیٹھی سن رہی تھی کچھ سوچنے لگی اور تھوڑی دیر بعد بچّے کے رونے کی سی آواز نکالی ——— مقرر ایک لمحہ کے واسطے رُکا اور پھر بولا۔

لڑکا :- غریب کا بچّہ رو رہا ہے۔ امیر کا ہنس رہا ہے۔ غریب کا بچّہ پیدا ہوتے ہی بھوک کے معنی جان جاتا ہے امیر مرتے دم تک اس لفظ سے نا آشنا رہتا ہے ——— وہ وقت دور نہیں جب غریب اپنے بچّوں کے رونے کی نہیں بلکہ ان کے قہقہوں کی آوازیں سنا کریں گے اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچّے ہمیشہ ہنستے رہیں تو اس وقت ذرا سی کڑی جھیل لو تو وارے نیارے ہیں تم یوں بھی تو اپنی اولاد کے لئے چوبیس گھنٹے خون پسینہ ایک کرتے ہو۔ صرف فرق اتنا ہے کہ ان مصیبتوں کے تم عادی ہو چکے ہو اور یہ نئی بات تم کو کٹھن معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ یاد رکھو روز روز کی مصیبت سے ایک دفعہ کی آفت جس سے ہمیشہ کو نجات مل جائے نعمت ہے ——— میرا تم پر بھروسہ ہے تم میری امیدوں کو ڈھاؤ گے نہیں ——— تم نے مجھے بلایا میں آگئی۔ پر ایک سوال لے کر آئی ہوں۔ تم سے بھیک مانگتی ہوں! میرے بھائی مجھے خالی ہاتھ نہیں جانے دیں گے۔ غریب ہندوستانی بھائی بہنوں کا حق ادا کیا کرتے ہیں۔ یہ بہن بھکارن تمہارے دروازہ پر آئی ہے اور تمہاری بُلائی ہوئی آئی ہے۔ اب لاج تمہارے ہاتھ ہے۔ رکھو گے؟

لڑکی :- ہاں رکھیں گے۔

در و دیوار سے یہی آواز آئی۔ لڑکا تھک کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر دونوں خموش بیٹھے رہے اس کے بعد لڑکی نے پانی کا گلاس بھر کر دیا اور کہا۔ خدا نظرِ بد سے بچائے کاش آپ اس کام میں میرے ساتھ ہوتے۔

لڑکا :- میں اب بھی ساتھ ہوں۔

لڑکی :- ایک بات رہ گئی۔

لڑکا :- وہ کیا؟

لڑکی :- اس تقریر میں مل اونر کے خلاف میں نے مزدوروں کو بھڑکایا نہیں اور یہ لازمی ہے۔ مجھے اس سے قلبی نفرت ہے۔ ایک مرتبہ اس کے گھر کو آگ لگوا دینی چاہتی ہوں۔

لڑکا :- میں معافی چاہتا ہوں (کہکر پھر اٹھا اور بولنے لگا)

لڑکا :- آپ کو معلوم ہے وہ بھکشا کیا ہے جسے دینے کا آپ نے اتنی آسانی سے وعدہ کر لیا۔ سنئے میں کل سنگدل مل اونر کے پاس گلے میں جھولی ڈالکر جاؤنگی گڑگڑاؤں گی۔ خوشامد کروں گی۔ کہ میرے بھائیوں کا حق دیدے۔ پر وہ کٹھور ہے۔ ظالم ہے۔ زر پرست ہے راضی ہوتا دکھائی نہیں دیتا میں اپنی سی سب کچھ

کروں گی۔ لیکن اگر اس ور سے دھتکاری جاؤں ٹھکرائی
جاؤں نراس واپس آؤں تو پھر تم سے یہ بھیک مانگتی ہوں
کہ بھوکے مرجانا کام پر نہ جانا۔ ہاں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ
یہ بہن بھی تمہارے ساتھ جان دے دیگی۔

لڑکا پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور لڑکی نے ایک خاص
نگاہ سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اتنے میں اسٹیشن
آگیا اور اسٹیشن ماسٹر نے اُن کے کمپارٹمنٹ پر آکر پوچھا
کہ سر احمد کریم اس ڈبہ میں ہیں۔ لڑکے نے کہا میں ہی
ہوں اُس نے ایک تار دیا ـــــ لڑکی یہ نام
سُن کر پریشان سی ہو گئی اور لڑکا تار پڑھنے لگا۔
چہرے پر ایک سکنڈ کے واسطے کچھ سایہ سا پڑا لیکن فوراً
گذر گیا۔ جیسے سورج کے سامنے لکۂ ابر ایک لمحہ کے لئے
آئے اور چلا جائے ـــــ اتنے میں ملازم آیا
بیش بہا کمخواب کا ڈرسنگ گاؤن اور اصلی ریشم کا
سلیپنگ سوٹ۔ سیپ کی تسبیح۔ قالین کی جانماز
نکال سیٹ پر رکھ گیا۔ لڑکا اُٹھ باتھ روم میں گھس گیا
ہیروئن عورت ذات تجسس کی پتلی۔ حوا کی بیٹی نہ رہ سکی۔
اور چپکے چپکے آن تار پڑھ لیا۔ لکھا تھا ـــــ
پتہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے پیشتر اطلاع نہ کر سکے
ابھی معلوم ہوا کہ آپ اس ٹرین سے آرہے ہیں اطلاعاً
عرض ہے کہ مزدوروں نے اسٹرائک کر رکھی ہے۔ اسی
گاڑی سے ایک سوشلسٹ لیڈر مس انجم نامی اُن کی بلائی
ہوئی آرہی ہیں مزدور بگڑا ہوا ہے۔ ہزاروں کی تعداد
میں اُن کے خیر مقدم کو اسٹیشن پر موجود ہوگا مناسب
معلوم ہوتا ہے کہ جناب ایک اسٹیشن پہلے اُتر جائیں۔
مزدوروں سے کوئی نازیبا حرکت ہو جانی بعید نہیں۔

ہیرو تھوڑی دیر بعد شب خوابی کے کپڑوں پر گراں بہا
ڈرسنگ گاؤن پہنے بڑی سج دھج کے ساتھ باتھ روم سے
برآمد ہوئے۔ قطب نما دیکھ جانماز بچھائی۔ لڑکی کے
پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھا رہے تھے بولی اگر مضائقہ
نہ ہو تو کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ تار کس بارے
میں تھا۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔

لڑکا:۔ کچھ نہیں بزنس تار تھا۔ ایک نیا معاملہ ہو رہا ہے۔

لڑکی:۔ کس قسم کا؟

لڑکا:۔ بارود اور دیا سلائی کا۔

اتنا کہہ جانماز بچھا نیت باندھ لی۔ جب نماز سے
فارغ ہوا تو تسبیح لے سیٹ پر آن لیٹا۔ لڑکی ہے
کہ کروٹیں بدل رہی ہے۔ آخر نہ رہ سکی تو پوچھا آپ
بمبئی پر اُتریں گے؟ اُس نے تسبیح دکھاتے ہوئے
سر سے ہاں کا اشارہ کیا جس کے معنی یہ تھے کہ پڑھ رہا
ہوں بات نہیں کر سکتا۔ پر اُتروں گا بمبئی ہی پر۔ اب
تسبیح ہلاتا ہوا اُٹھا سوائے ایک بیڈ لیمپ کے تمام

بتیاں بند کر دیں۔ اور پھر کھڑکیوں کی جانب کروٹ لے ہم سفر سے مُنہ پھیر لیٹ گیا۔ لڑکی ہار جھک مار کر اُٹھی تو یہ سو چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تو ٹہلتی رہی۔ پھر اپنا سوٹ کیس دھڑ دیسی کھولا میگزینز بڑے زور سے سیٹ پر پٹکیں۔ ایک کھڑکی چڑھائی ایک اتاری کھانسی۔ کھنکاری۔ غرضکہ اپنی سی سب کچھ کی۔ پر وہ تو مُردوں سے شرط باندھ کر سویا تھا۔ میر اشیر ٹس سے مَس نہ ہوا ——— صبح جو لڑکی کی آنکھ کھلی تو یہ بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا اور ملازم بستر طے کر رہا تھا۔ بیگم اُٹھ سیدھی ٹوئلٹ میں گھس گئیں اتنے میں یہ بھی نماز سے فارغ ہوئے۔ وہ بھی بن سنور کر نکل آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ چاء نہایت سلیقہ سے میز پر چُنی ہے تھوڑی سی ردو قدح کے بعد یہ پینے ہو بیٹھیں۔ اب باتیں ہونے لگیں۔

لڑکی :۔ ٹرین بمبئی کس وقت پہنچے گی؟

لڑکا :۔ آٹھ بجے۔

لڑکی :۔ اب کیا وقت ہے؟

لڑکا :۔ سات۔

لڑکی :۔ ابھی کے سٹیشن بیچ میں آئیں گے؟

لڑکا :۔ کوئی تین۔

لڑکی :۔ تو کیا آپ بمبئی ہی پہ اتریں گے؟

لڑکا :۔ جی ہاں۔

لڑکی :۔ میں کہتی ہوں ایک سٹیشن ادھر کیوں نہ اُترجائیں۔

لڑکا :۔ کیوں؟

لڑکی :۔ یوں ہی میرا دل چاہ رہا تھا کہ بمبئی کی نواح کو صبح صبح دیکھوں۔

لڑکا :۔ آپ تو کچھ عرصہ ہمارے شہر میں ٹھیریں گی سیر کر لیجئے گا۔ میں سیر کرا دوں گا۔

لڑکی :۔ جناب نے اب تک پتا پتہ تو مجھ کو بتایا نہیں۔

لڑکا :۔ نہیں کہہ سکتا ابھی پہنچ کر میرا پتہ بھی رہے گا یا نہیں۔

لڑکی :۔ کیا کہا۔

لڑکا :۔ کچھ نہیں میری مُراد ہے کہ شاید وطن پہنچکر مجھے انتقال کرنا پڑے۔

لڑکی :۔ خدانخواستہ۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

لڑکا :۔ میری مُراد ہے کہ جس جس مقام پہ اب ہوں وہاں سے شاید منتقل ہو جاؤں۔ اس وجہ سے فی الحال کوئی پتہ پیش نہیں کر سکتا۔

لڑکی :۔ نہ جناب نے اسم گرامی ہی بتایا میرا نام انجم ہے اور جناب کا؟

لڑکے نے خموشی کے ساتھ اپنے سرہانے سے لفافہ جس میں تار بند تھا اٹھا کر دے دیا۔ لڑکی نے اُسے پڑھا۔ پھر ہیرو کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ جیسے

رحمدل قصائی تیار بکرے کو دیکھے یا اوپریشن سے پہلے ڈاکٹر مریض پر نگاہ ڈالے۔ پھر تار نکال کر پٹہ ہٹنے لگی لڑکے نے احتجاج کیا لیکن اس نے ذرا پرواہ نہ کی _____ اب اٹھی اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ڈبہ میں ٹہلنے لگی۔

لڑکی :۔ آپ بمبئی پر اتریں گے ؟

لڑکا :۔ جی ہاں۔

لڑکی :۔ معلوم ہے مزدور آپکی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔

لڑکا :۔ میں مقدرات کا قائل ہوں۔

لڑکی :۔ موت کے منہ میں جانا کس نے بتایا ہے ؟

لڑکا :۔ موت وقت سے پہلے نہیں آتی۔

لڑکی :۔ آپ ڈرتے نہیں۔

لڑکا :۔ میں مرد ہوں۔

لڑکی :۔ میں آپ کو نہیں بچا سکوں گی۔

اس کے جواب میں لڑکا عجب انداز سے شانہ اونچے کرکے مسکرایا جس کے معنی یہ تھے کہ آپ کیا اور آپ کی بساط کیا _____ وہ پھر تھوڑی دیر ٹہلتی رہی۔ ذرا غصہ دھیما ہوا اور اب اس نے نئے ہتھیاروں سے حملہ کیا اور خوشامدانہ لہجہ میں بولی۔

لڑکی :۔ کیا آپ کو میری خاطر عزیز نہیں ؟

لڑکا :۔ مجھے اپنی عزت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

لڑکی :۔ آپکو موت کشاں کشاں لے جا رہی ہے۔

لڑکا :۔ موت وقت سے پہلے آ نہیں سکتی اور آئی ٹلتی نہیں۔

لڑکی :۔ آپ بے عزتی سے نہیں ڈرتے ؟

لڑکا :۔ ڈر نامرد کے لئے بے عزتی ہے۔

لڑکی :۔ اچھا تو آپ بمبئی ہی کے سٹیشن پر اتریں گے ؟

لڑکا :۔ ارادہ تو یہی ہے۔

لڑکی :۔ میرا ارادہ کچھ اور ہے۔

اتنا کہہ وہ خموشی سے دروازہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سٹیشن آیا۔ یہ دروازہ کھول کر پلیٹ فارم پر اُتری۔ پھر اپنی جگہ آن کھڑی ہوئی ریل چلنے لگی۔ پلیٹ فارم سے گذری ہی تھی کہ یہ کود پڑی۔ لڑکے نے گھبرا کر زنجیر کھینچ لی۔ ابھی ٹرین رُکنے نہ پائی تھی کہ وہ بھی کودا۔ اب تو اژدہام ہو گیا لڑکی کے سر میں چوٹ آئی تھی خون جاری تھا۔ لڑکے کا گھٹنا زخمی۔ سامان گارڈ کے حوالہ کیا۔ ملازم ٹیکسی لایا۔ دونوں مقامی ڈاکٹر کے ہاں پہنچے۔

لڑکی سر کی تکلیف سے بے چین تھی لیکن چہرہ پر فتحمندی کے آثار کھیل رہے تھے۔ معمولی مرہم پٹی کے بعد دونوں بمبئی پہنچے۔ لڑکی ہسپتال میں داخل کر دی گئی۔ مزدوروں کا جم غفیر سٹیشن سے مایوس واپس گیا۔

اطلاع ملی جے، جے ہوسپٹل میں زخمی پڑی ہیں۔ چند نمائندہ وہاں ملنے گئے۔ وقت کی خوبی جب یہ کمرے کے دروازے پہ پہنچے تو لڑکا مل کا مالک لنگڑاتا ہوا نکل رہا تھا۔ مزدوروں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا ———— اب یہ کمرے میں داخل ہوئے۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد دریافت کیا کہ جلسہ کب کیا جائے۔ بات چیت کے دوران میں ایک نے کہا۔ آپ سر احمد کریم کو جانتی ہیں؟ لڑکی کچھ سٹ پٹا سی گئی۔ یہ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد چلے گئے لیکن مشتبہ۔ اب چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ایک بولا پک گئی۔ دوسرے نے کہا دھکار ہے۔ غرضکہ افواہ کی لاکھ زبانیں جنبش میں آئیں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لڑکی کو کچھ خبر نہیں وہ غریب ہوسپٹل میں پڑی ہے کہ اتنے میں سر سہراب جی مل اونر کا ایجنٹ آیا۔ کارڈ پہ لکھا تھا بہت ضروری کام ہے۔ لڑکی نے بلا لیا۔ یہ ایک جہاں دیدہ شخص پہلے تو خیریت دریافت کی۔ پھر کہا سر سہراب جی نے کہا ہے کہ ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ شام کو سیر کے لئے موٹر بھیج دی جائے۔ لڑکی نے شکریہ کے ساتھ انکار کیا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے یہ ذکر بھی چھیڑ دیا کہ سر احمد کریم سے اُن کی تجارتی رقابت ہے اور اس کی مل میں ہڑتال جاری رکھنے میں وہ ہر طرح مدد دینے کو تیار ہیں۔ اس بات پہ لڑکی کے تیور بدلے لیکن وہ کچھ سوچ کر خموش ہو گئی۔ ان حضرت نے برسبیل تذکرہ یہ بھی فرما دیا کہ مل ہینڈز میں آپ کے خلاف خیالات پیدا ہو گئے ہیں۔ نیز شہر میں یہ بھی چرچا ہے کہ سر احمد کریم سے آپ کی رسم ہے۔ لوگوں نے انہیں یہاں آتے جاتے بھی دیکھا ہے۔ لڑکی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور کہا مجھے زیادہ باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پر یہ کب ٹلنے والے تھے۔ بولے بہت اچھا بہت اچھا۔ آپ ہرگز نہ بولئے۔ میں باتیں کرتا رہونگا تاکہ آپ کا دل بہلے۔ اب اس نے دنیا بھر کے قصّے شروع کر دئے۔ اور باتوں باتوں میں یہ بھی کان میں ڈالدی کہ سر احمد کریم نے آپ کی پوزیشن خراب کرنے کے لئے اپنے اور آپ کے تعلقات کا ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے۔ ہمارے سی، آئی، ڈی اُن کے مل میں رہتے ہیں ہم کو منٹ منٹ کی خبر دیتے ہیں۔ لڑکی کا ہاتھ بستر سے اُٹھ کر اُن کے مُنہ کی طرف آرہا تھا لیکن رُک گیا اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک سی آگئی۔ اتنے میں نرس نے آکر اطلاع دی کہ سر احمد کریم آئے ہیں یہ نام سُنکر سر سہراب کے ایجنٹ بغلیں جھانکنے لگے۔ اور لڑکی سے اجازت لیکر رخصت ہوئے۔ دروازہ

پر دونوں کی مُٹ بھیڑ ہوئی۔ اُنہوں نے نہایت تپاک سے سلام کیا۔ لڑکے نے متانت سے جواب دیا۔ اندر آنے کے بعد ہیرو نے زخموں وغیرہ کی بابت دریافت کیا پھر کہا۔

لڑکا:۔ میں ایک بات کی معافی چاہتا ہوں آئندہ احتیاط رکھنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

لڑکی:۔ کیا بات؟

لڑکا:۔ میں بغیر وقت کا تعین کئے آجاتا ہوں۔

لڑکی:۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں۔

لڑکا:۔ تاہم آپ کے پاس دس اور بھی ملنے والے آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی میرے سامنے آنا پسند کرے۔ کوئی نہ کرے۔ اور شاید آپ بھی اسے اچھا نہ سمجھیں۔

لڑکی:۔ مطلب؟

لڑکا:۔ کچھ نہیں۔ یہ سیاست کی دنیا ہے اس میں سب ہی رنگ کرنے پڑتے ہیں۔

لڑکی:۔ (بستر پہ اُٹھ بیٹھی) صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ کیا جناب مجھ کو سر سہراب کا ایجنٹ تصور فرماتے ہیں؟

لڑکا:۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ ان کا ایجنٹ یہاں آیا تھا میں آتا تھا کہ وہ نکلے۔

لڑکی:۔ جناب کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ مجھے پورا پورا اختیار ہے جس سے چاہوں ملوں اور جس سے چاہوں نہ ملوں۔ نیز یہ امر بھی گوش گذار کر دینا چاہتی ہوں کہ میں بھی یہاں لیٹی لیٹی سب افواہیں سنتی رہتی ہوں۔

لڑکا:۔ کیا افواہ؟

لڑکی:۔ کچھ نہیں۔ صرف اتنی کہ مل ہیسنڈز کی نگاہوں میں میری پوزیشن خراب کرنے کے لئے حضور میری اور اپنی اتفاقی شناسائی کو شہرت دے رہے ہیں۔ بہر کیف یہ سیاست کی دنیا ہے اس میں سب رنگ کرنے پڑتے ہیں۔

لڑکا یہ الفاظ سنکر کھڑا ہو گیا۔ چہرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زہر آلود نشتر دل و جگر کے پار ہو گیا ہو اور وہ بھی کسی دوست کے ہاتھ سے ــــــــــــ

نہایت خموشی سے کمرہ کے باہر چلا گیا۔ کواڑ بند ہونے تھے کہ لڑکی نے تکیہ میں مُنہ چُھپا کر رونا شروع کیا۔ شام کو ڈاکٹر نے آکر دیکھا تو بخار تھا۔

لڑکا تمام رات ان مقامات پہ پھرتا رہا جہاں عارضی سکون بکتا ہے۔ دولت لٹاتا رہا۔ شربت کی تلاش میں شراب لنڈھاتا رہا۔ غم کا اندھا دل کے زخم سیتا پھرا۔ لیکن زہر میں بجھی ہوئی سوئیوں سے پھول کا مارا۔ گل خوردہ کاغذی پھول دیکھ کانٹوں میں گھس گیا۔ دامن تار تار ہو گیا۔ پھول ہاتھ نہ آیا

———— پیاسا شراب سے خشک ہونٹ تر کرنے
چاہتا تھا مت مارا پاپ نگر میں پریم ڈھونڈتا پھرا۔
گانٹھ کا پورا آنکھ کا اندھا کنچن کو کندن سمجھا ————

لیکن جب اس دنیا سے تھکا ہوا واپس آیا تو زبان پر یہ شعر تھا ؎

بے یار جا کے ہم نے گلستاں میں کیا کیا
ہاں یہ کیا کہ داغِ کہن کو ہرا کیا

دوسرے دن لڑکی کے پاس پھر وہی سہراب جی کے ایجنٹ آن موجود ہوئے اور لگے الٹی سیدھی باتیں کرنے۔ آج لڑکی کا رویہ بدلا ہوا تھا وہ ان کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔ رجحانِ طبع دیکھ کر انہوں نے کہہ ہی دیا کہ اگر وہ سر احمد کریم کی ملز میں اسٹرائک ابھی اور جاری رکھوائیں تو پانچ ہزار روپیہ روز کے حساب سے نذر کیا جا سکتا ہے۔ یہ فقرہ لڑکی نے تلخ دوا کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتارا۔ اب انہوں نے لڑکی کو ان تمام لوگوں کے نام بتا دیئے جو ان کی جانب سے مل میں فساد کرانے کے لئے چھوڑے گئے تھے۔ لڑکی نے کچھ غور کے بعد کہا۔

لڑکی:۔ لیکن میری پوزیشن تو مل مینیجرز میں خراب ہو چکی ہے وہ اب میری کیوں سننے لگے۔

ایجنٹ:۔ اس کا انتظام کر لیا جائے گا بشرطیکہ آپ ہمارے کہنے پر چلیں۔

لڑکی:۔ آخر کس طرح؟

ایجنٹ:۔ دیکھئے اوّل تو اسٹرائک کے تمام لیڈر ہمارے آدمی ہیں اور کرائوڈ ان کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرف چاہیں گے موڑ دیں گے۔ دوسرے آپ کی تقریر میں ایسے پہلو رکھے جائیں گے جن سے آپ کی پوزیشن صاف ہو جائے اور سارا الزام مل کے مالک کے سر جائے۔

لڑکی:۔ اس کے لئے آپ کیا پہلو اختیار کریں گے؟

ایجنٹ:۔ واقعات کو دوسرے رنگ میں ڈھال لیا جائے گا۔ مثلاً آپ ریل میں سے اس لئے کود دیں کہ سر احمد کریم آپکی عزت پر ہاتھ ڈال رہے تھے۔

لڑکی:۔ پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں میں نے عدالت کا دروازہ کیوں نہ کھٹکھٹایا۔

ایجنٹ:۔ اوّل تو موب ان تفصیلات کو سوچتا نہیں تاہم اس کا جواب بھی موجود ہے۔

لڑکی:۔ وہ کیا؟

ایجنٹ:۔ آپ نے ترکِ موالات کے زمانے سے انگریزی عدالت میں جانے کا عہد کر لیا ہے اس لئے ان کو قرار واقعی سزا نہ دلوا سکیں۔

لڑکی:۔ میں سمجھ گئی۔ اچھا میرا دماغ تو صحیح کام

کر نہیں رہا۔ آپ یہ تقریر لکھوا کر بھیج دیجیے اور انکے نام مجھے لکھ دیجیے جو آپ کے ایجنٹس مل ہیں کام کر رہے ہیں۔

نام تو ان صاحب نے فوراً لکھ دیئے۔ اور تقریر بھیجنے کا وعدہ کر گئے ——— لڑکی کو اوّل تو پہلے ہی سے رنج تھا۔ پھر مرضی کے خلاف باتیں سنیں اور ضبط کیا۔ بخار تیز ہو گیا۔ اس پہ طرّہ یہ کہ تھوڑی دیر بعد نرس نے لا کر ایک موٹا سا لفافہ دیا جس میں سہراب کی جانب سے خط تھا اور چند کاغذات لکھا تھا ——— افسوس ہے کہ راقم الحروف نے آپ کی پوزیشن دانستہ یا نادانستہ خراب کی۔ بہرکیف منسلکہ تقریر اس کی تلافی کر دے گی۔

ظالم نے وہی پہلو لیا تھا جو ایجنٹ نے تجویز کیا تھا۔

تقریر کا پڑھنا تھا کہ لڑکی کی حالت خراب ہو گئی۔ اب جو ڈاکٹر نے آ کر دیکھا تو بے ہوش پڑی تھی اور ہذیانی کیفیت۔ بار بار کریم کا نام لیتی۔ اور کہتی تھی کس قیامت کے یہ تامے میرے نام آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے مسٹر کریم کو ٹیلیفون کر کے حالت بتائی وہ گھبرایا ہوا آیا۔ ڈاکٹر نے کہا بُخار بگڑ گیا ہے۔ وہ بڑی دیر تک سر پکڑے لڑکی کے سرہانے بیٹھا رہا۔

وہ بار بار آنکھ اٹھا کر دیکھتی مگر پہچانتی نہ تھی۔ برف کے کپڑے ماتھے پر رکھے۔ اس کا نام لیکر پکارا۔ اس نے آنکھ بھر کر دیکھا بھی مگر نظریں فہم و تفہیم سے خالی تھیں تسلسل بہکی ہی تھی۔ کبھی کہتی کریم۔ انجم غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔ تم کو سمجھی نہیں۔ لیکن مر جائیگی جھکے گی نہیں۔ اپنے نام کی لاج رکھو آجاؤ۔ کبھی تقریر کے نقرہ دوہراتی۔ گاہ اپنی پوزیشن خاک میں ملا دینے پر آمادگی ظاہر کرتی تو لمحہ بھر بعد سہراب کو بُرا بھلا کہنے لگتی رات گئے لڑکا وہاں سے واپس آیا۔ انجم کی طبیعت بھی قدرے سکون پذیر تھی ادھر یہ پریشان خاطر پلنگ پر لیٹا اُدھر لڑکی کی آنکھ کھلی۔ سر پہ ہاتھ رکھا۔ کچھ سوچا۔ اب دماغ کی حالت درست تھی لیکن سخت کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ نرس کی نگاہیں مریض پہ جمی تھیں۔ وہ مشین کی طرح اُٹھی گلوکوس کے دو گھونٹ دیئے نبض دیکھی سر کا کپڑا بدلا اور کہا سو جاؤ۔ اور خود چارٹ پر ٹمپریچر نوٹ کرنے لگی انجم نے کاغذ قلم مانگا۔ نرس نے دینے سے انکار کیا مریضہ نے لجاجت سے کہا۔ بس دو سطریں لکھوں گی اس کے بغیر مجھے سکون نہیں ہو گا۔ ایک فرض انجام دینا ہے نرس کو ترس آ گیا۔ کچھ مناسب بھی یہی سمجھا فاؤنٹین پن اور کاغذ دے دیا لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ

زیادہ نہ لکھیں۔ اب کمزوری اور جذبات سے کپکپاتے ہاتھوں سے لڑکی نے لکھنا شروع کیا۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

جناب کی مل میں مندرجہ ذیل ملازمین سر سہراب سے ملے ہوئے ہیں۔ نیز اسٹرائک بھی انہوں نے ہی کرائی ہے۔

مطلع کنندہ

ایک غلط فہمی کا شکار۔ خوددار

لفافہ پر کریم کا پتہ لکھ بند کر تکیہ پر سر رکھ پھر پڑ گئی انتہائی کمزور ہو چکی تھی۔ اتنی تکان بھی برداشت نہ کر سکی اور بے سدھ پڑ گئی ——— صبح ہی کریم کو خط ملا پڑھ کر بے چین ہو گیا۔ سیدھا ہوسپٹل پہنچا موقع شناس نرس ٹل گئی۔ مگر جاتے جاتے اتنا کہہ گئی کہ زیادہ باتیں نہ کیجئے گا۔ یہ بہت کمزور ہیں۔ تھوڑی دیر تو خموشی طاری رہی۔ وہ ہم سے چپ ہیں ہم اُن سے چپ ہیں منانے والا کوئی تھا نہیں جو مناتا۔ لڑکا سر جھکائے کرسی پر بیٹھا رہا۔ لڑکی کا سر تکیہ پر پڑا رہا۔ تھوڑی دیر میں انجم کے آنسوؤں سے تکیہ تر ہو گیا۔ اب لڑکے نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ گھبرا کر اُٹھا۔ پانی کا گلاس بھر کر دیا اور پھر پاؤں پکڑ لئے۔ درمیانِ جان و جاناں ماجرائے رفت رفت ——— بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر ——— جانبین سے آنکھوں آنکھوں میں اظہار ندامت و پشیمانی ہوا۔ اور یہ قرار پایا کہ آئندہ کسی حالت میں بھی ایک دوسرے کی طرف سے غلط فہمی میں نہیں پڑیں گے جو بات ہو گی صاف صاف پوچھ لیں گے ———
انجم کے اصرار پر یہ بھی فیصلہ ہو گیا کہ وہ سر سہراب سے ساز باز کر کے معاملات کی تہ تک پہنچ جائے اور پھر جیسا مناسب ہو اقدام کیا جائے۔ اتنے میں نرس دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آئی۔ کریم اجازت لے کر رخصت ہوا
انجم اس روز سوائے سر سہراب کے ایجنٹ کے اور کسی سے نہ ملی۔

اسٹرائک ابھی تک جاری تھی۔ انجم کی علالت نے پروگرام اپ سٹ کر دیا تھا۔ لیڈرز سر جوڑ کر بیٹھے۔ آگ ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی۔ شعلے بھڑکتے رکھنے لازمی۔ مزدوروں کو کسی نہ کسی دھن میں لگائے رکھنا اشد ضروری ——— سکون دماغوں کو سوچنے کا موقع دیتا ہے اور لیڈرز کے لئے یہی سم قاتل۔ سر سہراب کے تنخواہ داروں نے رائے دی کہ مشاعرہ کیا جائے۔ پیسہ کی کمی نہ تھی۔ اول تو مزدوروں ہی سے کافی چندہ جمع کیا جا چکا تھا۔ علاوہ بریں سر سہراب کی سنہری مدد شامل حال تھی۔ — بڑے بڑے مزدور پرست شعرا سارے ہندوستان سے بلائے گئے۔ علاوہ سفر خرچ کے کسی نے دو سو لئے کسی نے

چارسو ایک صاحب تو ٹھیرے بھی تاج ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا سواگت سٹیشن پر بڑے زور شور سے ہوا۔ گلے میں ہار پڑے۔ پھول نچھاور کئے گئے۔ مزدوروں کی گاڑھی کمائی ٹھیک لگی۔

جھونپڑی پر مشاعرہ ہونا قرار پایا۔ مزدور کے گھر اندھیرا تھا۔ یہاں دن نکلا ہوا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ننگے پھر رہے تھے۔ یہاں آرائش میں تھان کے تھان خرچ کر دیئے گئے تھے۔ وہاں ٹکڑا کھانے کو نہ تھا۔ یہاں پان سگریٹ سوڈا لیمن کا دَور تھا۔ اُس کے پیروں میں جلوسوں کے ساتھ ننگے پیر پھرتے پھرتے چھالے پڑ گئے تھے۔ یہاں مزدور نواز شعراء کے لئے موٹریں دوڑ رہی تھیں ——— سامنے سے ایک جوگی اور جوگن گاتے ہوئے گزرے۔

دنیا ایک تماشہ بابا۔ دنیا ایک تماشہ
مورکھ کے گھر فاقہ بابا مورکھ کے گھر فاقہ
ایک کمائے ایک لٹائے دنیا یہی کہلائے
مورکھ کے گھر فاقہ بابا۔ مورکھ کے گھر فاقہ

بھبوت ملے بال بکھیرے یہ بھی مجمع میں مل گئے۔ اب منتظمین پریشاں خاطر اِدھر اُدھر دوڑتے نظر آئے معلوم ہوا کہ ایک شاعر صاحب پی کر بگڑ گئے ہیں اور بیٹھے تمام چھوٹے بڑے لیڈرز کو بے نقط سنا رہے ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ اپنے ساتھ ایک پن چھلا لائے ہیں اور انکے نام کے پچاس مزید چاہتے ہیں ورنہ مشاعرہ میں آنے سے قطعاً انکار۔ چارسو کی رقم پہلے چیر چکے ہیں۔ منتظمین کے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ یا تو وہ رقم بھی آئی گئی سمجھیں۔ یا پچاس اور بھینٹ چڑھائیں۔ یہ آوازیں جوگی جوگن کے کانوں تک پہنچیں۔ جوگی مسکرایا۔ جوگن نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

اب مشاعرہ شروع ہوا کسی نے غزل پڑھی کسی نے نظم بعض نے گیت گائے۔ ایک مقبول ہوا۔ ایک مردود۔ سامعین نے کسی کو بٹھانے کا حکم صادر کیا کسی کو پڑھوانے کا۔

ایک صاحب نے یہ گیت الاپا اور داد سخنوری لی۔

ہم باپ کی دنیا ڈھا دیں گے
اِک دنیا نئی بسا دیں گے

ایک اور بزرگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے یزید، شمر، اور ابولہب کی شان میں قصیدہ پڑھ ڈالا۔ سامعین میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کافر۔ ملحد کی آوازیں بلند ہوئیں۔ صدر اور منتظمین نے خموشی اور شانتی کے احکامات نافذ کئے۔ دو چار پتھر بھی سٹیج تک پہنچے مجمع قابو سے نکلا جاتا تھا۔ صدر نے کھڑے ہو کر سکون کی تلقین فرمائی۔ لیکن جب بات بھڑک چکی تھی" نکال دو" کی صدائیں بلند تھیں۔ آخر سامعین میں سے ایک شخص اُٹھا جناب صدر سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ صدر

نے دریافت کیا کہ ان کی تقریر کا مدعا کیا ہوگا؟ جواب ملا۔ مجمع کو پُرسکون بنانا۔ صدر کی اجازت سے یہ مرد خدا اسٹیج پہ آیا۔ سامعین اس سے روشناس معلوم ہوتے تھے مائک کے پاس جاکر اس نے کہا۔ بھائیو! اول تو میں جناب صدر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ازراہِ ذرہ نوازی اس کمترین کو سٹیج پہ آنے کی اجازت عطا فرمائی اور آپ سے دو دو باتیں کرنے کا موقع دیا۔ پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو شعرا تشریف فرما ہیں، ان کے سفر خرچ اور اس سے بہت زیادہ کی مزدور سبھا کفیل ہوئی ہے ذرا اس کا خیال رہے۔ نیز ہر شخص کو اپنے بزرگوں کی تعریف کرنے کا حق ہے۔ جس طرح ہم اپنے اپنے بڑوں کی توصیف کرتے ہیں۔ ان صاحب نے اپنے بزرگوں کی ثناخوانی کی۔ ان کے بزرگ یزید شیطان اور ابو جہل ہی ہوں گے ——— یہ الفاظ سنکر مجمع ہنسنے لگا اور پُرسکون کیفیت ہوگئی۔ لیکن شیطان پرست یزید نواز شاعر صاحب مشاعرے سے نہایت برہم ایک لوڈی گارڈ کے ہمراہ نکلے۔ سُنا ہے راستہ میں وادِ بے داد ہوئی۔ اور ان بزرگ نے مسجد میں پناہ لی ——— تیری شان تجھے بُرا کہنے والے بھی تیرے ہی دامن کرم میں پناہ لیتے ہیں۔ جل جلالہٗ۔

اب ایک اور صاحب نہایت معشوقانہ انداز سے بال سنوارتے ہوئے سامنے آئے اور ایک مختصر سی تقریر کے بعد یہ بول الاپے ؎

مزدور کے دم سے ہے سنسار
مزدور ہے سب کا پالن ہار

اس "پالن ہار" نے سنسار ہلا دیا۔ جلسہ بالکل بے قابو ہوگیا۔ ٹوپیاں بھی اُچھلیں جوتیاں بھی۔ گھونسم گھاسہ۔ جوتم پیزار ہوئی محفل مشاعرہ کی اکھاڑہ تھا بھیم کا۔ مزدور کو پالن ہار کہنے والے دل وجگر بجور ہڈی ٹہڈی چور چور یا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے۔ انتہائی ذلت وخواری کے ساتھ ایک دوست کے گھر میں جاکر چھپے۔ جوگی جوگن نے بھی اپنی راہ لی۔ ایک طرف بند موٹر کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے ان کو آتا دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ دونوں اس میں جا بیٹھے۔ کریم کی کوٹھی کے پچھلے دروازہ پہ موٹر رکی اور یہ جوڑا کمرہ میں داخل ہوا۔ جب جوگ اُتار یہ اصل روپ میں آئے تو کریم اور انجم تھے۔

لڑکی ہوسٹل سے اُٹھ ایک فلیٹ پہ آن رہی تھی دوسرے دن صبح ہی سر سہراب کے ایجنٹ نہایت سراسیمہ پہنچے۔ بولے سارا کام بگڑ گیا۔ اب لاج آپ کے ہاتھ ہے لڑکی بولی کیا ہوا۔ انہوں نے رات کی تمام حالت بیان کی۔ شعرا کو سخت سُست کہا۔ پھر یہ بتایا کہ ہمارے ایجنٹس

کے علاوہ مزدوروں کا ایک اور لیڈر بھی ہے جو ہم سے الحاق نہیں رکھتا۔ کل رات بھی اس نے ایک شاعر کو خفا کر دیا مزدور بہت کچھ اس کے کہنے میں ہیں۔ لڑکی بولی تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں۔ ایجنٹ نے جواب دیا وہ آپکو بہت مانتا ہے۔ آپ اگر اسے اور اس کے ساتھیوں کو سمجھا دیں تو کام بن جائیگا۔ نہیں تو یہ بنا بنایا کھیل خراب ہوا جا رہا ہے اور پھر آپ جانتی ہیں یہ سرمایہ دار مزدور کو پیس ڈالے گا اتنا کہتے ہوئے نہایت بڑی رقم کا چیک میز پر رکھ دیا۔ لڑکی نے کنکھیوں سے دیکھا اور بولی یقیناً اس ٹھوکر سے مزدور کو بچانا ہمارا فرض ہے۔ میں ہر خدمت کے لئے تن من دھن سے حاضر ہوں۔ مزدور کی حفاظت ہمارا دھرم ہے۔ مزدوروں کے اس لیڈر کا نام کیا ہے۔ ایجنٹ نے کہا۔ رحیم بخش۔ آخر یہ قرار پایا کہ رحیم بخش اور اس کے ساتھیوں کو انجم کے پاس بھیج دیا جائے۔ پھر وہ نبٹ لے گی۔

ایجنٹ خوش خوش سدھارے۔ شام کو چند مزدور رحیم بخش کی سرکردگی میں انجم سے ملنے آئے۔ یہ رحیم بخش وہی شخص تھا جس نے جلسہ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ہر ایک کو اپنے بزرگوں کی تعریف کا حق ہے۔ انجم کی یہ بہت عزت کرتا تھا۔ بمشکل تمام نہایت اصرار پر کرسی کے ایک کنارے پر ہو بیٹھا اس کے دوسرے ساتھی بھی سکڑ سکڑا کر کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔

لڑکی :۔ آپ کے لئے چا منگواؤں؟

رحیم بخش :۔ جی نہیں۔

لڑکی :۔ کچھ سوڈا لیمن۔

رحیم بخش :۔ مہربانی۔ ہم کو پیاس نہیں ہے۔ اسکے علاوہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ ہم زیادہ دیر تکلیف دینی نہیں چاہتے۔

لڑکی :۔ میری فکر نہ کیجئے۔ میری تو انتہائی تمنّا یہ ہے کہ مزدور جاتی کی خدمت کرتے ہوئے مر جاؤں سنا ہے اس روز مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔

رحیم بخش :۔ جی ہاں۔ ان لوگوں نے کفر بکنا شروع کر دیا۔ جس کی ہم تاب نہ لا سکے۔

لڑکی :۔ خدا معلوم یہ کیا دبا کھیلی ہے یقین جانئے ان میں سے نوے فی صدی محض فیشن کی خاطر بکواس کرتے ہیں۔ ورنہ بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا اس کا۔ علاوہ بریں میری رائے میں خدا کے خلاف کچھ کہنا انتہائی بیوقوفی بھی ہے اور بدتمیزی بھی۔ بیوقوفی تو اس لئے کہ جب ایک چیز کا تم وجود ہی نہیں مانتے تو خواہ مخواہ اس کے خلاف الفاظ ضائع کرنے چہ معنی دارد۔ اور بدتمیزی اس لئے کہ جب ایک شخص دوسرے کے باپ کو اس کے روبرو برا نہیں کہتا اس لئے کہ باپ عزیز ہوتا ہے تو پھر ایک تمیزدار انسان خدا پرست کے

روبرو خدا کو نعوذ باللہ من ذالک کیسے بُرا کہہ سکتا ہے اس لئے کہ ہم کو زیادہ سے زیادہ جو ہستی عزیز ہے وہ ذاتِ پاک ہی سُنا ہے آپ اُس روز پیش پیش تھے۔

رحیم بخش:۔ (آنکھیں نیچی کر کے) کیا عرض کروں مجھ سے رہا نہ گیا۔

لڑکی:۔ خدا ہر خدا پرست کو یہی توفیق عطا فرمائے جزاک اللہ ——— سنا ہے اسٹرائک کھلتی معلوم ہوتی ہے۔ مزدور اکتا گئے ہیں۔

رحیم بخش:۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں؟

لڑکی:۔ فرمائیے۔

رحیم بخش:۔ آپ کے قدموں پر میری جان نثار۔ مزدور تو پیچھے ہٹنے والا نہیں کچھ لیڈر دکاروٹ ڈالتے ہیں ۔ ہے۔

لڑکی:۔ میں سمجھی نہیں۔

رحیم بخش:۔ آپ کو زیادہ دیر باتیں کرنے سے تکان تو نہیں ہو گی۔

لڑکی:۔ ہرگز نہیں۔ آپ کہے جائیے میں تمام حالات سے واقف ہونا چاہتی ہوں۔

رحیم بخش:۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو مزدوروں کو آٹھ آنہ روز تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ صاحب ہم فقیر نہیں جو خیرات پر گذر کریں۔ پھر سوال یہ ہے کہ یہ رقم آتی کہاں سے ہے۔ دو ہزار ہم لوگوں نے آپس میں جمع کیا تھا۔ کچھ مزدور سبھا سے ملا۔ اب تک خرچ ہو چکا ہے اس سے بہت زیادہ۔ یہ ساری رقم کہاں سے آئی۔ جب یہ سوال اُٹھایا تو لیڈرز بغلیں جھانکنے لگے۔ اور بس اتنا جواب دیا کہ ایک ہمدرد ہماری مدد کر رہا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ سر سہراب کی مل اور ہماری مل میں پرانی رقابت ہے۔ پہلے تو ہم کو شبہ ہوا۔ پھر ہم نے اپنے آدمی چھوڑے تو یہ چیز ثابت ہو گئی کہ سر سہراب کے روپیہ سے اسٹرائک چلائی جا رہی ہے۔

رحیم بخش نے اتنا کہنے کے بعد اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا اور کہا:۔

رحیم بخش:۔ تم بتاؤ۔ تم کیا دیکھا؟

ساتھی:۔ جی میں اور رمضو سویرے ہی سے اصغر علی کے گھر پہ جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ہم کو پہچانتا نہیں سو کیا دیکھتا ہوں کہ موٹر میں سے ایک آدمی اُترا۔ اور اُس کے گھر میں گھس گیا۔ ہم نے بھی اِتی دیر میں ٹیکسی بلا موٹر پہ کھڑی کر لی وہ آدمی تو باہر نکلا اور رمضو بیٹھ ٹیکسی میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ میں اپنی ڈیوٹی پہ کھڑا رہا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد اصغر علی نکلا اور بینک جا پہنچا میں بھی سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ لگا رہا اس نے چیک دیا۔ مجھے تھوڑی سی انگریزی کی حرف شناسی ہے میں نے پڑھ لیا سر سہراب جی کے دستخط تھے۔

لڑکی :۔ تم اتنا پڑھنا جانتے ہو؟

سانکھی :۔ جی ہاں۔

لڑکی :۔ معاف کیجیے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ کسی نتیجہ پر پہونچنے سے پہلے ہر بات کی تصدیق کر لوں۔

یہ کہتے ہوئے اس نے پرس میں سے چک نکالکر میز پر رکھ دیا اور بیان دینے والے سے دریافت کیا کہ یہ دستخط کس کے ہیں؟ اس نے فوراً کہہ دیا سر سہراب کے۔ اب رحیم بخش کے چہرہ سے کچھ پریشانی اور مکدر ظاہر ہونے لگا۔ انجم تاڑ گئی۔ بولی۔

لڑکی :۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ بہن کا اعتبار کیجیے۔

رحیم بخش نے شرمندہ ہو کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

لڑکی :۔ اچھا تو پھر کیا ہوا؟

سانکھی :۔ (رحیم بخش سے آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت لے کر) اب اصغر علی بھی چل آیا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے۔ رمو مجھ سے پہلے پہنچا ہوا تھا اس نے بتایا کہ موٹر سر سہراب جی کے بنگلہ پر گئی۔ اور وہ آدمی وہاں اتر گیا۔

لڑکی :۔ اچھا ایک بات اور بتاؤ۔ اس روز مشاعرہ میں جو جھگڑا ہوا تھا اس میں ہندو مسلمان سب شریک تھے؟

سانکھی :۔ جی ہاں۔

لڑکی :۔ لیکن شاعر نے تو مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگائی تھی۔ ہندو کیوں بگڑے؟

سانکھی :۔ بات یہ ہے کہ ہم سب ایک ایشیا کے رہنے والے ہیں۔ ہم ہندو مسلمان کچھ نہیں جانتے جو رحیم بخش کو بری لگی سو ہم سب کو بھی بری لگنی ہی تھی۔

لڑکی :۔ جزاک اللہ۔ یہی جذبہ ہندوستان کو ترقی کے راستہ پر لے جا سکتا ہے۔ یقین جانئیے میں آپ کو بھائی سمجھتی ہوں اور یہ بہن ساتھ چھوڑنے والی نہیں معاف کیجیے گا میں نے آپ سے اچھی خاصی جرح کی لیکن میں معاملہ کو پوری طرح سمجھ کر اطمینان کر لینا چاہتی تھی دنیا میں آدمی کچھ لیتا ہے تو کچھ دیتا بھی ہے۔ میرے پاس آپ نے سر سہراب کا چک دیکھا اور یقیناً آپ کے دل میں مختلف قسم کے خیالات پیدا ہوئے ہوں گے پہلے اجازت دیجیے کہ میں ساری داستان شروع سے اب تک کہہ سناؤں پھر آپ کو حق ہوگا مجھ سے سوالات کر کے اپنا اطمینان کر لیں اس کے بعد اگر آپ کی خوشی ہو تو مجھے اپنا شریک کار کریں۔ ورنہ نہیں۔

رحیم بخش :۔ ہم کو بغیر سنے آپ پر اعتبار ہے۔

لڑکی :۔ آپ کی مہربانی۔ تاہم میں اپنے اطمینان خاطر کے لئے چاہتی ہوں کہ من و عن آپکو سنادوں۔

اس کے بعد لڑکی نے شروع سے آخر تک ساری ماجرا

کہانی کہہ سنائی اور مزدوروں سے سوالات کرنے کی درخواست کی۔

رحیم بخش :۔ آپ نے اپنے اطمینان کے لئے سنائی ہم حلفاً سننے رہے سننے سے پہلے بھی آپ پر اعتماد تھا۔ اور اب بھی ہے مزدور کا پھر دسہ نمک کی دیوانہ نہیں جو ایسے چھینٹوں سے بہہ جائے ہم صرف حکم کے منتظر ہیں آپ جو فرمائیں گی اس پر عمل کیا جائے گا۔

لڑکی :۔ معاملات نے بالکل نئی شکل اختیار کر لی ہے اب ذرا مجھے سوچ لینے دیجئے۔

لڑکی تھوڑی دیر کمرہ میں ٹہلتی رہی مزدور ساکت دجامد بیٹھے رہے اس کے بعد اس نے ٹھہر ٹھہر کے ان سے کہنا شروع کیا۔

لڑکی :۔ میں اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں اس میں جہاں آپکو اختلاف ہو بلا تکلف فرما دیجئے گا۔ میں سر سہراب اور ان کے تمام تنخواہ داروں کو اپنے ہاں بلاتی ہوں۔ آپ مزدوروں کے کچھ نمائندے لیکر پہلے سے آجایئے اور دوسرے کمرے میں سے ہماری تمام باتیں سن لیجئے۔ اس طرح یہ پورے کا پورا اجتماع سامنے آجائیگا اور پول بھی کھل جائے گی۔

مزدور اس تدبیر پر راضی ہوگئے۔ لڑکی نے سر سہراب کو ٹیلیفون کیا اور شام کے چار بجے کا وقت دیا۔ مزدوروں کو یہ ہدایت کرکے کہ اس بات کا ذکر زبان پہ نہ آئے رخصت کردیا۔ نیز یہ بھی کہہ دیا کہ اوروں کو کسی بہانہ سے ساتھ لے آئیں بعد میں معاملہ بتائیں۔ تین بجے کا وقت قرار پایا —— خود لڑکے کے پاس جاکر سب کچھ کہہ سنایا۔ وہ پریشان خاطر سا ہوا۔

لڑکی :۔ کیا یہ تدبیر غلط ہے؟

لڑکا :۔ خدا کی قسم کارڈنل رشلو بھی اس پر ناز کرسکتا ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان جھگڑوں میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے اور مجھے آپ اس مل اور اسکے سارے معاملات سے زیادہ عزیز ہیں۔

لڑکی :۔ اور مجھے آپ کا وقار اور مزدوروں کی فلاح دنیا کی ہر شئے سے زیادہ عزیز۔ نیز سچائی کے راستے میں کھونا بھی پانا ہے۔ نیت بخیر ہے تو بیڑا پار ہے۔ اب تو بیڑا اٹھا لیا۔

لڑکا :۔ ماشاءاللہ یہ دل کی زبان ہے۔ دل کی کائنات زیروزبر کررہی ہو۔

غرضکہ تین بجے مزدور آگئے۔ لڑکی نے سب کچھ سمجھا دیا اور دوسرے کمرے میں بٹھا دیا۔ لڑکا ریڈیو روم میں گولیاں بھر بند موٹر میں گھر کے آگے آن جما۔ چار بجے سر سہراب وارد ہوئے اور ان کے سارے چیلے چانٹے لڑکی نے باتوں کا ایسا عنوان ڈالا کہ ساری داستان اور سازش سامنے آگئی۔ آگے کیا کرنا ہے یہ بھی کھل گیا

مطلب کیا ہے اس کا بھی اظہار ہو گیا۔ اب لڑکی نے چاء بنانی شروع کی۔ اور سب نے پیالیاں ہاتھ میں اُٹھائیں۔

لڑکی :- میں بھولی۔ ابھی کچھ اور بھی مہمان آنے ہیں۔

اتنا کہہ کر وہ دوسرے کمرہ کے دروازہ کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ وہاں سے آگے آگے رحیم بخش اور پیچھے سارے مزدور برآمد ہوئے کسی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹی۔ کوئی کرسی سے ٹکراتا ہوا بھاگا۔ کسی کو گرما گرم چاء کا اچھو ہوا۔ سر سہراب کرسی سے ٹکرائے۔ پگڑی لڑھک گئی۔ غرضکہ تو مجھ پہ اور میں تجھ پہ اس کمرے سے نکلے۔ لڑکا ریوالور ہاتھ میں لئے بلڈنگ کے دروازہ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جب ان کو بحالت تباہ نکلتے دیکھا تو موٹر کا دروازہ کھول کر باہر آنے ہی کو تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ اور ڈرائیور کو کہا جا کر بلڈنگ میں دیکھو کچھ جھگڑا فساد تو نہیں ہو رہا۔

آخر کار تمام معاملات بخیر و خوبی انجام پا گئے۔ غدار ذلیل ہو کر نکلے۔ اسٹرائک کھل گئی مزدوروں کے جائز مطالبات منظور کئے گئے۔ بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ احمد زندہ باد اور انجم زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔

گذشتہ واقعات کی کشا کش اور بیماری نے انجم کے اعصاب پر سخت اثر کیا تھا۔ کریم نے سامان سفر تیار کرالیا۔ انجم کو خبر بھی نہ ہوئی۔ ایک روز سیٹ ریزرو کروا انجم کے ہاں جا پہنچا اور نادرشاہی حکم داغ دیا کہ دو گھنٹہ کے اندر منصوری چلنا ہے۔ وہ بھلا کب ماننے والی تھی بولی :-

لڑکی :- چہ خوش چرا نہ باشد۔ بندی تو اب ٹلی جائے گی۔

لڑکا :- میں نے تو سیٹس بھی بک کرالیں۔

لڑکی :- کینسل کرا دو۔

لڑکا :- سوئے میں کمروں کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔

لڑکی :- تو ہم کیا کریں۔ ہم سے پوچھا تھا۔

لڑکا :- میرا کیا ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ کچھ دن وہاں رہ کر آپ مجھ سے تقریر کرنے کے چند گر سیکھ لیتیں۔ بہر کیف آپ کی خوشی۔ میں ٹیلیفون کر کے رزرویشن کینسل کئے دیتا ہوں۔

لڑکی :- یہ آپ نے پہلے سے کیوں نہ کہا میں ضرور چلوں گی۔

انجم

آج شبِ برات ہے۔ تمام رات دھڑیاں چھٹتی رہیں اُڑن ہتابیوں کے فلک پیما وزن اپنی پرواز دکھاتے رہے۔ غبارش خانہ اور سوئی والوں کا شاہ جی کے تالاب پر مقابلہ ہوا۔ اُدھ سیری اور پو سیری اناروں نے گل افشانیاں کیں۔ خدنگہ آسمان کی خبر لائے۔ چرخ گردش چرخ دکھلانے۔ پٹاخوں کی لڑی لڑی بند چھٹی۔ شور و شر کے متوالوں نے کنستروں میں بند کر کے چھوڑی۔ بزم میں رزم کا مزا آیا۔ مسلمان بارود سے آج بھی کھیلتے ہیں لیکن بچوں کے کھیل۔

آتش بازوں کی دکانیں انواع و اقسام کے مال سے پٹی پڑی ہیں۔ گاہک پر گاہک ٹوٹا پڑتا ہے۔ نو عمر بھی ہیں کہنہ سال بھی۔ یہاں باتوں کی پھل جھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔ گاہک آپس میں بھی چہل کر رہے ہیں دوکاندار سے بھی۔ ایک پیر نود سالہ مرد جوں ہر شو جرس جان میگر وہ کی زندہ مثال بنے چھ سالہ صاحبزادے کو گود میں لئے کھڑے ہیں۔ بڑھاپے کی اولاد ویسے بھی پیاری ہوتی ہے اور پھر جوان بیوی سے۔ آشنایانِ راز فقرہ کس رہے ہیں۔

بڑے میاں جو گھی لڑا رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے چچا آج نواسہ کو گود میں لے آئے تو کوئی پوتا بتاتا ہے۔ بڑے میاں کو اس پر ناز ہے کہ پانچ سیر کا اصلی گھی کھلایا ہے تیس سیر کا آٹا۔ اب بھی سیروں میں پہر اڑا کر سویرے ہی سویرے سو پچاس ڈنڈ نکال لیتے ہیں تاکہ ادوان کسی رہے۔ ایک نوعمر چابک دست نے دامن میں لڑی باندھ دی۔ بڑے میاں نے بھانپ لیا جب تک دیا سلائی نہ لگے ان کا کچھ بگڑتا نہیں۔ مسلسل پینترے کاٹ رہے ہیں۔ وہ اپنی گھات میں ہے یہ اپنی چال میں۔ آخر چلتے ہوئے دامن میں سے لڑی کھول بیٹے کے حوالہ کی اور کہا لو بیٹا بیوقوف دیتے ہیں عقلمند لیتے ہیں۔

گھر گھر کڑھاؤ چڑھے ہیں۔ حلوے تیار ہو رہے ہیں۔ کہیں سخت ہیں تو کہیں نرم۔ کسی نے لوز اتیں کاٹی ہیں تو ایک نے بیسن کا بنایا ہے اور اس میں سیروں گھی کھپایا ہے۔ بعض گھروں میں چاولوں کا تیل ہو رہا ہے۔ غرضکہ اپنی اپنی حسب توفیق حلوے بن رہے ہیں۔ اور خوب بن رہے ہیں۔ امیر کے مردہ کی بھوک سوا من کی

ہے تو غریب کا بھی ایک دو دھڑی کھا ہی لیتا ہے۔ اسلام کا مذاق بنایا جا رہا ہے۔ دولت نے مذہب کو کھلونہ بنا دیا اس رات کو خدا پرست مسجدوں میں جا کر یادِ خدا کرتے تھے گھر اکیلے رہ جاتے زمانہ مامون نہ تھا۔ چند افراد قریہ کی حفاظت اپنے ذمہ لے لیتے۔ ان کی یہی عبادت تھی۔ کوچہ و بازار میں ٹولیاں بنا بنا کر پھرتے جگار قائم رکھنے کے لئے بندوقیں سر کرتے رہتے۔ آج اس نے یہ شکل اختیار کر لی جس کی ایک جھلک ہم نے ابھی دیکھی۔ دولت کی زیادتی تعلیم کی کمی۔ ذہن کی پستی اسی کو کہتے ہیں۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

غریب امیر سب شب برات منا رہے ہیں اور خوب دھوم دھام سے منا رہے ہیں۔ عزیزوں کے ہاں خوان لگ لگ کر آتش بازیاں بھیجی جا رہی ہیں۔ چھوٹوں کو بڑے شب براتیاں دے رہے ہیں ——— بچی کھچی دولت نذرِ آتش کی جا رہی ہے۔ خدا مبارک کرے اور راس لائے۔

نواب احمد علی خاں کی محل سرا میں نوکرانیاں ماما ئیں لونڈیاں باندیاں ایلی گیلی بھر رہی ہیں۔ بڑی چہل پہل ہے ——— ڈیوڑھی پر آکر ڈولی لگی۔ رحیم بخش ڈیوڑھی دار نے آواز دی لال سنو بیں کی سواری اتروا لو۔ گلشن لپک جھپک پہنچی۔

نہایت سلیقہ کی بیگم پائنچہ سنبھالے تشریف لائیں ایک آٹھ سال کا لڑکا ساتھ۔ گورا رنگ پتلی جلد رخساروں پر نیلی نیلی رگوں کا جال ایسا نمودار جیسے شفق میں سے کہیں کہیں آسمان کی تحریر جھلکے۔ روشن آنکھوں پہ لمبی پلکیں جیسے کوئی شعلہ رخسار زلفیں لٹکائے بیٹھی ہو۔

متناسب اعضا بوٹا سا قد۔ جوڑوں کا گٹھا دیتہ دے رہا ہے کہ ابھی ورزش تو شروع نہیں کرائی ہے ہاں کاروان ہاتھ تیل مالش کرتے رہتے ہیں۔ سر پہ قرمزی مخمل کی کارچوبی ٹوپی اس میں سچے موتیوں کا پھندنا۔ آخر میں زمرد کی مڑیاں آویزاں ——— چکن کا کرتہ۔ کمخواب کی صدری۔ لٹھے کا تنگ موری کا پاجامہ۔ چال میں وقار۔ گفتار میں ادا۔ دیکھن میں شعور غرض کہ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ ہر بات سے رئیس زادہ نظر آئے۔ ہر ادا میں خاندانی رنگت جھلکے۔

ماں بیٹے ابھی چند قدم ہی گئے تھے۔ گھر والی بیگم دوپٹہ سنبھالتی دوڑی آئیں۔ جھک کر سلام کیا جس طرح چھوٹے بڑوں سے گلے ملتے ہیں اسی طرح سر سینے کے قریب لا کر جھکا دیا۔ انہوں نے گلے لگایا دعائیں دیں ——— ہمارے گلے ملنے کے بھی الگ الگ طریق ہیں۔ بہت چھوٹے بڑوں کو سلام کر سر جھکا کھڑے ہو جاتے

ہیں۔ بڑے ان کے سر پہ ہاتھ رکھ دعائیں دیتے ہیں جن کی عمر میں تھوڑا تفاوت ہو وہ سلام کے بعد سر جھکاتے ہیں۔ بڑے ان کے سر کو ہاتھ کھول کر سینہ سے لگا لیتے ہیں لیکن چھوٹا ہاتھ گرائے کھڑا رہتا ہے۔ ہم عمر برابر والے سینہ بہ سینہ بغلگیر ہوتے ہیں۔

بہرکیف دونوں بیگمیں دالان کی طرف روانہ ہوئیں صاحب خانہ نے آنے والی سے کہا بھلا آپا یہ آج آپ نے کیا نئی بات کی میں تو خود آ رہی تھی۔ جواب ملا۔ تو کیا ہوا ابو تم بھی آ جانا۔ میں تمہارے پڑوس میں نواب بیگم کے ہاں آئی تھی۔ دل نہ مانا ادھر بھی آ گئی کہو سب اچھی طرح ہیں۔ بہن نے کہا خدا کا شکر ہے آپ کی دعا ہے۔

بیگم کے پیچھے مامائیں سینیاں لئے آئیں سب پہ رنگارنگ خوان پوش ڈھکے تھے۔ صاحب خانہ نے اپنے ہاتھ سے کھولے۔ کسی میں آتش بازی تھی کسی میں میٹھا۔ بیگم بولیں اے اللہ رکھے انجم کہاں تو بلاؤ خالہ اماں کو سلام کرے۔ ملازمہ جا ایک چھ سالہ بچی کو بلا لائی۔ تھوڑی تارہ ماتھے چاند۔ دسوں انگلیاں دس چراغ۔ کتابی چہرہ غلافی آنکھ۔ رنگ میدہ و شہاب صراحی دار گردن۔ ہونٹ جیسے بھانجواں ڈورہ۔ مرگ کی آنکھ۔ دیکھنے میں کچھ ایسی مٹھاس کہ

ان ہوئے کو پیار آئے۔ آتے ہی نہایت ادب سے خالہ اماں کو آداب کیا۔ انھوں نے پیار کر گود میں بٹھا لیا اور بولیں یہ آتشبازی تمہارے لئے لائی ہوں بچی نے ذرا آنکھیں اونچی کر کے ماں کی طرف دیکھا اجازت طلب کر رہی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ لے لو بیٹی خالہ اماں دے رہی ہیں۔ تھوڑی سی اس وقت لے جاؤ باقی رات کو چھوڑنا۔ دیکھو بھائی کو ساتھ لے جاؤ۔ گلشن جا بیوی کے سامنے آتش بازی چھوڑ۔ دیکھ بچوں کو دور رکھیو۔ بچی دو قدم جا کر ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔ امی ہم روپا کو بلا لیں۔ ماں نے اجازت دی۔ خالہ نے پوچھا یہ روپا کون ہیں۔ بہن نے بتایا کہ انجم کی سہیلی ہے ہمارے پڑوس میں ایک لالہ صاحب رہتے ہیں ان کی لڑکی ہے۔ ان بیگم کو اس کے بغیر قرار ہی نہیں۔ جب تک وہ نہ ہو یہ نوالہ نہیں توڑتیں اور سچ یہ ہے کہ وہ بھی اسے ایسا ہی چاہتی ہے خود بعد میں کھائے گی پہلے اس کے لئے دو پور بار دے جائیگی۔ یہ بھی ہندو کے ہاں سے مٹھائی کچوریاں منگا کر الگ لٹکائے رکھتی ہیں۔ میں کہتی ہوں اچھا ہے اپنے دونوں کونے میں بیٹھی کھیلا کرتی ہیں۔

آتش بازی چھٹنی شروع ہوئی۔ بھلا پیچھے وہ

کھڑے رہنے والے تھے۔ کچھ گلشن اپنے تماشہ میں اندھی ہو گئی۔ ہونی شدنی بات انجم کے دامن پر ایک چنگاری جا پڑی۔ تن زیب کا باریک کرتہ دیکھتے دیکھتے بھڑک اٹھا۔ بچّی کے منہ سے چیخ نکلی۔ یوسف بہن سے لپٹ گیا۔ بچّہ تو محبت اور ہمدردی میں لپٹا تھا لیکن قدرت کو اس طریق سے انجم کو بچانا منظور تھا دو چار جگہ آبلے پڑ گئے۔ یوسف کا سینہ بھی قدرے جلا پر اللہ نے سب کی جانیں بچالیں۔ مائیں دوڑی بھاگی آئیں حکیم صاحب اور جراح کے پاس ملازم دوڑائے گئے۔ ان کے آتے آتے کاہی لگا دی۔ صدقہ اترے گلشن پر بے تحاشہ پڑیں۔ چوٹی پکڑ کر نکال دینے کا حکم صادر ہوا لیکن وہ بھی خانہ زاد تھی۔ کوئی اور ٹھکانا نہ تھا۔ دو دن پڑوس میں پڑی رہی بیگم صاحب کا حکم تھا کہ اس ہونڈی کاٹی کو میرے سامنے نہ آنے دو۔ وقت کے ساتھ غصّہ بھی دھیما پڑ گیا۔ روپا کی ماں نے سفارش کی۔ انجم کی ماں نے کہا اچھا آجائے۔ یہ ناشدنی میرے سامنے نہ آنے پائے۔

ہفتہ عشرہ میں خدا کے فضل سے انجم بھی اچھی ہو گئی یوسف بھی۔ بڑی دھوم دھام سے خوشی منائی گئی دلی کی جامع مسجد پہنچا خیر خیرات ہوئی۔ ملّانے کھلائے گئے۔ گھمنڈی سقّے نے دس سیر کھایا۔ بچّے سب درگاہوں پر گئے۔ نذرانہ دئے۔ چادریں چڑھیں یہ تمام رسومات ساتھ ادا ہوئیں۔

دونوں میں کچھ ایسی معصوم دوستی ہوئی کہ ایک کو دوسرے کے بغیر قرار نہیں۔ بی انجم ہر چوتھے دن کپڑے پہن اماں کے کولے سے لگ آن بیٹھیں۔ وہ کہیں خالہ اماں کے ہاں جاؤ گی یہ گردن جھکا لیں۔ ملازمہ ساتھ ہو لو کر ہمراہ جائے۔ یہ دن بھر وہاں رہیں رات کو واپس۔

ادھر یوسف کا بھی یہی حال۔ جہاں انجم کو آئے کچھ دن ہوئے اور انہوں نے رٹ لگانی شروع کی ہم تو خالہ جان کے ہاں جائیں گے۔ ایک ایک چیز انجم بہن کے لئے سینت کر رکھیں کہ جب وہ آئیں گی ہم تو جب کھائیں گے۔ ماں لاکھ کہے کہ پھر پکوا دوں گی پر یہ کب ماننے والے تھے۔ آخر وہاں حصّہ لگ کر جائے تب یہ نوالہ توڑیں۔

اب رہیں بی روپا۔ اوّل تو وہ خود بھی قیامت کی ملنسار اور موہنی تھی پھر انجم کی سہیلی۔ غرضکہ ان تینوں کا کچھ ایسا گٹھ بندھن بندھا کہ ایک پل کو جدا ہونا گوارا نہ تھا۔

ایک روز یوسف اپنے گھر میں بیٹھا آتش کے گھر بنا رہا تھا انجم تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ہوا تیز تھی یہ بنائے

وہ ڈھادے۔ روبا اپنی دھوتی کا پلّو پھیلا کھڑی ہوگئی اور بولی بھیّا میں ہوا ردکوں کی قسمت کے معاملات بچّوں کی باتیں واللہ اعلم منشاءِ ایزدی کیا تھا بچّوں سے کیا کہلوایا جا رہا تھا۔

ایک روز کی بات انجم کے پائیں باغ میں یہ تینوں نونہال کھیل رہے تھے۔ بوڑھا مالی گلابوں میں پیوند لگا رہا تھا۔ انجم نے پوچھا کیا کر رہے ہو۔ وہ پیوند لگاتے ہوئے بولا اب یہ دونوں پودے ایک ہو جائیں گے بی بی۔ انجم اس کے چاقو سے کھیلنے لگی اتفاق کی بات انگلی کٹ گئی۔ بچّی تو تھی ہی لگی رونے۔ یوسف برابر کھڑا تھا جو بچّہ بہن کو بہلانے اپنی انگلی پہ چاقو پھیرنے لگا وہ بھی کٹ گئی۔ اب انجم کی انگلی برابر رکھ بولا۔ یہ دونوں پودے ایک ہو جائیں گے بی بی۔ روبا نے اپنی چُندری کا کونا پھاڑ پانی میں بھگو باندھ دیا۔ اپنی انگلی بھی برابر رکھ دی اور بولی۔ میں کیوں الگ رہوں۔

قدرت بچّوں کے مُنہ سے کیا کہلوا رہی تھی مُقدّر کو کیا کرشمہ کاریاں دکھانی تھیں۔ ان بچپن کی باتوں کے کیا نتیجے نکلنے تھے۔

یہ تینوں ساتھ پروان چڑھتے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ محبّت بڑھتی رہی۔ اب خیر سے انجم دس کی ہونے آئی اور یوسف بارھویں میں لگا۔

اُدھر اُس نے امورِ خانہ داری سیکھے۔ اُستانی سے تو پڑھتی ہی تھی۔ کلام پاک ختم ہوا ——— یوسف ایک طرف پڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف باپ نے گھر میں اکھاڑا کھلوا دیا۔ خلیفہ جی صبح شام آ کر ورزش کرا جاتے۔ لڑنت بتا جاتے۔ لڑکی نے روپ نکالا۔ لڑکے نے ہاتھ پیر۔ والدین کو نسبتوں کی فکر ہوئی قدرتاً نگاہ پہلے خاندان ہی میں پڑتی تھی۔ لڑکی والوں کی تو زبان بند ہوتی ہے۔ ایک دن یوسف کی امّاں نواب صاحب سے اجازت لے بہن کے گھر آن پہنچیں اور بات ڈال دی۔ ان کو کیا انکار تھا۔ ہاں اتنا ضرور کہا کہ اس کے باپ سے بات کر لوں وہ بھی اس لئے کہ کہیں یہ نہ خیال گذرے کہ مُنہ کھولے ہی بیٹھی تھیں کہتے ہی راضی ہوگئیں ورنہ حقیقت میں ان دونوں کی نظر بھی یوسف پہ تھی۔

بڑی دھوم دھام سے نسبت ہوئی مٹھائی بٹی کئی دن مہمانداری رہی۔ اب بی انجم کا یوسف سے پردہ ہو گیا۔ پھر بھی یہ خالہ کے ہاں اکثر آتے جاتے انجم چھپ جاتیں یہ خالہ خالو کو سلام کر چلے جاتے۔

مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔ اس طرف تو یہ رشتۂ محبّت قوی سے قوی تر ہو رہا تھا۔ مگر گردش کی یہ

خصوصیت ہے کہ جب اس کے سرے کھینچے جائیں تو وہ اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ بعینہ عقدِ الفت بھی جانبین کے بُعد سے طاقت پکڑتا اور سخت تر ہو جاتا ہے۔

جب سے انجم پردہ کرنے لگی تھیں آتشِ شوق تیز تر ہو گئی تھی۔ اور دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی یوسف میاں خالہ جان پاس بیٹھے نیچی نیچی نظروں سے چاروں طرف دیکھتے کہ شاید کہیں نظر پڑ جائیں۔ اُدھر بی انجم کوٹھڑی میں بیٹھی تو رہتیں لیکن دل لوٹن کبوتر کی طرح پھڑ پھڑاتا۔

فلکِ کینہ پرور اس یکجائیِ مہر و ماہ پر راضی نہ ہو سکا اور دراندازیاں شروع کیں۔ انجم کے والد کی ایک بہن تھیں دلدار بیگم اور اُن کے دو لڑکے میاں سارا سرمایہ ختم کر چکے تھے۔ بڑا لڑکا ایک ریاست میں مصاحب گیری کرتا اور پیٹ پالتا تھا اب انہیں چھوٹے کی فکر تھی۔ پڑھا لکھا واجبی ہی واجبی تھا۔ اس پر نوابی طبیعت۔ ماں ہمہ وقت اسی فکر میں رہتی تھی کہ اس کی کس طرح گذرے گی۔ ان کی چشم آز انجم پر تھی۔ جانتی تھیں کہ باپ کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور پھر اکلوتی لڑکی۔ اگر یہاں رشتہ ہو جائے تو لڑکا بیوی کی دولت سے مزے کرے گا۔

جب انجم اور یوسف کی نسبت ہوئی تو اُن کے تیر سا لگا۔ ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ لڑکے کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ لیکن عورت ہمت والی تھیں جانتی تھیں کہ جب تک نکاح نہ ہو جائے ہزار باتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔

دل کو پریشاں خاطر پاکر دماغ نے راہیں سوچنی شروع کیں قسمت کی بات اسی وقت صاحبزادہ تشریف لے آئے۔ ماں نے پوچھا صبح سے کہاں تھے۔ بولے بڑے مرزا سے شطرنج کھیل رہا تھا وہاں بازی اڑ گئی اُس میں یہ وقت ہو گیا پر میں بھی مات دیکر ہی آیا ماں بولیں یہ بڑے مرزا کون ہیں۔ جواب ملا ماموں ابا کے مصاحبوں میں سے ہیں شطرنج ظالم غضب کی کھیلتا ہے۔ دور دور جواب نہیں۔ پر واہ رے میں ایک ہی چال میں تیورا دیا۔ بیٹا شطرنج کی چالیں گنوا رہا تھا اور ماں مستقبل کے نقشے بنا رہی تھی۔ کچھ سوچ کر بولی تمہاری ان کی زیادہ ملاقات ہے۔ بیٹے نے اثبات میں جواب دیا۔

بیٹے نے پان مانگا۔ ماں نے پٹاری سے کر گلوری دی محبت بھری نگاہ سے دیکھا اور کہا ان سے رسم و راہ بڑھالو۔ پھر ساری بات بتائی۔ تدبیر یہ تھی کہ کسی طرح ان کو ملا کر رخنہ اندازیاں کی جائیں۔ انجم کے ابا کانوں کے کچے ہیں ایک آدھ بات بھی بڑھی

سیدھی اگر سُن لی تو بگڑ جائیں گے اور اپنا کام بنجائیگا ——— مصاحب شور باچٹ نوالہ حاضر پیسہ کے میت ہوتے ہیں ابھی تو ہم دعوتوں پر لگائیں گے ہاں یہ وعدہ ہوگا کہ جس دن یہ نسبت ٹوٹ جائے ہم سے مقررہ رقم لے لیں۔

لڑکا بھی ماشاء اللہ سیانا تھا۔ سب اونچ نیچ سے واقف۔ مرزا صاحب سے باد اللہ بڑھالی ایک دو بازیاں جان کر ہار گیا۔ ان کی چال کی تعریف کی۔ بھرے پر چڑھایا۔ چند بار بد کر کھیلا اور ہارا۔ مرزا تو لاگو ہوگئے۔ صبح شام دروازہ پر کھڑے ہیں ——— ایک روز موقع پا بیگم صاحبہ نے خود بات کی۔ پہلے تو ٹٹولا جب ڈھب پر آتے نظر آئے تو سبز باغ دکھا مطلب بھی بیان کردیا۔ امیدیں بھی دلائیں۔ مرزا نے امداد کا وعدہ کرلیا۔

بات بگڑنی تھی ملے ہوئے دل ٹوٹنے تھے چرخ تفرقہ انداز کا چاہا ہوا ——— بڑے مرزا موقع کی تلاش میں تھے۔ ایک روز شام کو انجم کے والد کوٹھے پر کبوتر اڑا رہے تھے۔ قاسم جان کی گلی میں یوسف کے ایک دوست نے اس کے کبوتر کھول لئے۔ اول الذکر کی ٹکڑی میں ایک نیا جانور تھا وہ بچھڑ دوسری ٹکڑی میں جا ملا۔ ادھر نواب نے نکال لینے کی کوشش کی اُدھر پھانسنے کی تدبیر ہوئی۔ آخر وہ جانور ہاتھ سے جاتا رہا۔ نواب کے منہ سے نکلا یہ انہوں نے کیا کیا ہماری ان کی تو صلح ہے سید نہیں۔ مرزا بولا یہ حضور کا حسن ظن ہے۔ نواب نے کہا کیا کہتے ہو مرزا لگے بات ٹالنے۔ نواب نے اصرار کیا تو دبی زبان سے اتنا بولے کہ حضور ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ آپ کے انکے طرح طرح کے رشتہ ہیں۔ یہ نیا نہ منہ کیوں بُرا بنے۔ کان گنہگار رہیں صبح سے شام تک ہزاروں طرح کی باتیں سُننے میں آتی ہیں۔ آپ کے سامنے دُہرانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ہم لوگ مزاج سے واقف ہیں سُنی اَن سُنی کر جاتے ہیں۔ بہر نوع حضور کی ان سے صلح ہے تو خادم جا کر کبوتر واپس لے آتا ہے۔ اتنا کہہ ٹوپی سر پر رکھ سیدھے ہولئے۔ ادھر نواب نے ٹکڑی بند کردی اور لگے راہ دیکھنے۔ تھوڑی دیر بعد مرزا منہ لٹکائے واپس آئے۔ نواب نے کہا کیا ہوا فرمایا کچھ نہیں۔ نواب نے بگڑ کر پوچھا منہ سے کیوں نہیں پھوٹتے۔ بولے کیا عرض کروں نہ جاتا تو بہتر تھا اب تو دہی ہوئی کہ بات بھی کھوئی التجا کر کے۔ میرا تو کچھ نہیں آپ کی بات گئی اس کا ملال ہے۔ نواب نے کہا آخر جواب کیا دیا۔ یہ منہ بنا کر بولے۔ میں نے ان سے عرض کیا حضور کی ہمارے نواب صاحب سے صلح

ہے سید نہیں تو جواب ملا۔ صَید کو مرد چھوڑا نہیں کرتے آج سے سید سہی۔ میں اپنا سا منہ لے کر چلا آیا۔ نواب ان باتوں سے کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ چہرہ کے اُتار چڑھاؤ بتا رہے تھے کہ تیر نشانہ پر لگا ہے اب ان زخم پر صرف نمک پاشی درکار ہے اور مزید چغلخوری کی نشترکاری۔

مرزا نے ایک اور کو اپنے ساتھ گانٹھ لیا۔ قصہ گھڑ گھڑ کر سنائے۔ کبھی ایک کہے۔ کبھی دوسرا۔ نواب کچے کانوں کے کچے اور پھر نوابی خون۔ بات بڑھ گئی ——

یوسف غریب کو خبر بھی نہیں وہ سیدھے سبھاؤ حسبِ دستور آیا تو خالو کے تیور بدلے ہوئے پائے۔ وہ بھی رئیس زادہ تھا کھٹک گیا زیادہ دیر بیٹھا نہیں۔ گھر گیا تو طبیعت مکدّر تھی۔ ماں نے پوچھا تو یہ ٹال گیا۔ رخنہ انداز دل نے اس کے والد کے بھی کان بھرے ادھر آمد سخن بیٹے کے منہ سے بھی ایک آدھ بات نکل گئی۔ ان کے دل میں بھی کنا پڑی۔ اس پہ طرّہ یہ ہوا کہ ایک جائداد میں زینہ مشترک تھا اس پر کرایہ داروں میں کچھ کہن سُن ہوئی وہ اپنے اپنے مالک جائداد کے پاس گئے یعنی ایک آیا انجم کے والد کے پاس اور ایک آیا یوسف میاں کے ابا کے ہاں۔ بات بڑھا بڑھا کر بیان کی۔

دل میں خرابیاں پڑ چکی تھیں۔ ویسے تو کوئی بات نہ تھی وہ اپنے کرایہ دار کو سمجھا دیتے یہ اپنے کو لیکن اب

بنا بگڑ چکی تھی۔ دلوں میں خراش آچکی تھی۔ یہ چنگاری آگ بن گئی۔ نوبت عدالت تک پہنچی۔ وہ اپنے گھمنڈ میں ان کو اپنا طنطنہ۔ وکیلوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ لگائی بجھائی کرنے والوں نے ایک ایک کی سو سو کر سنائیں۔ شہر میں ایک نہایت بدمعاش وکیل امیر نام کا تھا انجم کے والد نے اس کو بھی کر لیا۔ اس ظالم نے ایک ایک مقدمہ کے دس دس بنا کھڑے کئے۔

ایک روز مرزا نے انجم کے والد سے جا لگائی۔ کہ خدا خیر کرے۔ دشمنوں کے کان بہرے۔ حضور میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایسی سُنائی سننے میں آئی ہے نواب نے پوچھا کیا ہوا خیر تو ہے۔ مرزا بولے روپیہ ہاتھ کا میل ہے اور پاک پروردگار کا ہر طرح کرم ہے کوئی کمی نہیں۔ پر اب عزتوں پہ بات آ رہی ہے۔ نواب نے کہا قصہ کیا ہوا۔ وہ بولا سرکار کیا کہوں زبان نہیں اٹھتی۔ وہاں نصیب دشمناں وکیلوں سے مل کر حضور کو جیل کرانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ نواب کے آگ ہی تو لگ گئی۔ فوراً محمد امیر کو بلوایا۔ یہ نواب کے چھوڑوں میں بہت گھسا ہوا تھا۔ جب تک وہ نہ آیا نواب صاحب دیوان خانہ کی چھت پر ٹہلتے رہے۔ آتے ہی کہا کہ اس طرف یہ تدابیر کی جا رہی ہیں۔ جو کہو سو دینے کو تیار ہوں یہ داؤں الٹا ہو جائے۔ محمد امیر نے کہا سرکار یہ قانون

ہے یہاں پورپور پر داؤں ہوتا ہے۔ خدا نے چاہا تو اب کی پیشی پر ایسا چھکا ماروں کہ پھڑپھڑاتے رہ جائیں عدالت ہی میں گرفتار نہ کرایا ہو تو میرا بھی نام محمد امیر نہیں آپ سب دیکھئے گا۔

پیشی کی تاریخ آئی۔ یوسف کے والد پر جرح ہوئی تھی محمد امیر جانتا تھا کہ سخت تنک مزاج ہیں ایک دو سوال ایسے بے موقع چبھتے ہوئے کئے کہ نواب کا مزاج برہم ہو گیا۔ ان کا یہی مدعا تھا منہ سے غصہ میں نکل گیا۔ لونڈے بچے تیری یہ مجال۔ عدالت نے توہین عدالت میں دھر والیا۔ انہوں نے الفاظ واپس لینے سے انکار کیا کام بگڑ گیا۔ گرفتاری عمل میں آئی۔ نواب تھا بات کا پکا جیل بھگتی پر الفاظ واپس نہ لئے۔

اس واقعہ کے بعد کہرام مچ گیا شہر میں ہنسی پڑ گئی اپنے پرائے بوکھلا گئے۔ یوسف مقدمات کی پیروی کرتا رہا لیکن یہ ناگہانی ایسی پڑی تھی کہ وہ بھی بَورا سا گیا۔ سمجھ ہی تو تھا جہاں تک بن پڑا اسار سے کام کرتا رہا۔ لیکن دل سے ایک ہوک اٹھتی اور بیچ کلیجہ مسوس کر رہ جاتا۔

بند گاڑی میں عدالت جاتا۔ گھر سے آنا جانا ترک احباب سے ملنا جلنا موقوف۔ اسی حالت میں جیل کے افسران سے رسوخ پیدا کیا۔ باپ کے لئے وہاں تمام آسائشیں بہم پہنچائیں۔

جب باپ بیٹے ان حالات میں ملے دلوں کا وارث اللہ ہی تھا۔ ایک دوسرے نے آنکھ سے آنکھ ملائی نہیں باتیں سب کرلیں۔ باپ نے ضروری ہدایات دیں۔ کہا میرے بعد بھی تم ہی کو سب کچھ کرنا پڑتا اب بھی یہی سمجھو۔ میں اب دلّی میں رہنا نہیں چاہتا۔ جہاں تک جلد ہو سکے تمام جائداد فروخت کردو۔ مقدمات نمٹا دینے چاہتا ہوں۔ نفع نقصان کی پروا نہ کرو۔ دولت عزّت کے لئے ہے۔ کھانے کو تو آدمی چنے چبا کر بھی گزر کرلیتا ہے۔ میرا خیال ہے بمبئی جا رہیں گے۔ اب مجھے دلّی بُری لگنے لگی ہے۔

میعادِ قید گزر گئی جسمانی آسائش بیٹے کی کوشش اور روپیہ کی بدولت میسّر تھی۔ لیکن روح کو قرار نہ ملا شریف انسان سب کچھ برداشت کرلیتا ہے۔ نہیں برداشت ہوتی تو ذلت۔ دل میں ناسور پڑ جاتے ہیں یہ چوٹ کھا کر ابھرنا مشکل ہے۔ یہی یوسف کے والد کا حشر ہوا۔ کچھ دن جیے لیکن مُردوں سے بدتر۔ منہ سے اُف نہ کرتے۔ دل میں بھٹی سلگ رہی تھی۔ جو آنکھیں کبھی کسی کے سامنے جھکی نہ تھیں وہ اپنوں کے روبرو بھی اٹھتی نہ تھیں۔ انجام کار دل کے دورے پڑنے لگے۔ وفا شعار بیوی بھی خود دار میاں کا یہ حال دیکھ کر

گھلنے لگی۔ غرضکہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے یوسف کے سر سے دونوں کا سایہ اٹھ گیا۔

غیر شہر اجنبی مقام۔ لاکھوں کی آبادی۔ پر اپنا کوئی نہیں۔ یوسف کا ابھی سن ہی کیا تھا۔ بہت ہوگا سترہ کا۔ رئیس کا بچہ ناز و نعم کا پلا بوکھلا سا گیا جس کی نگاہیں ماں باپ دیکھتے رہتے تھے، اب وہ مانوس نظروں کو ڈھونڈے اور نہ پائے۔ تابڑ توڑ آفتیں آئیں۔ جائداد کچھ مقدمات کی نظر ہوئی کچھ جلدی میں کم دام اٹھے۔ ادھر بمبئی کے دلالوں نے بیوقوف بنایا۔ ایک طرف اپنی لاکھوں کی چیز ہزاروں میں بکی۔ دوسری طرف ہزاروں کی لاکھوں میں ملی مقدر کا نقصان تھا گردش تھی بھگتنی پڑی۔

لڑکا سعید تھا اور خاندانی دماغ۔ ایک دفعہ مصائب مسلسل سے لڑکھڑا گیا۔ لیکن پھر سنبھلا۔ تمام چیزوں کا جائزہ لیا اور پرپرزے سمیٹ ہو بیٹھا اب بھی اللہ کا کرم تھا ایک دم کو کوئی کمی نہ تھی۔

یوسف بمبئی میں بے یار و مددگار تھا نہ کوئی سنگ سنگاتی نہ ملنے جلنے کو ساتھی۔ یہ دن رات احباب میں گھرا رہنے والا ایک آرہا ہے ایک جا رہا ہے۔ دیوانخانہ غنچہ بنا رہتا تھا۔ اب کوئی بات کرنے کو نہ رہا۔ کرتا کیا ادھر ادھر گھوم پھر کر وقت گذارتا۔

ایک روز شام کو میرین ڈرائیو پر بیٹھا تھا سامنے سے ایک تیس سالہ عورت بنی سنوری گزری۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ بھی دیدہ دری تھی اور یوسف بھی دیدہ زیب سرخ و سفید رنگ۔ دل کی پھبن۔ چہرہ پر خاندانی وقار سڈول ہاتھ پیر۔ یہ تو لگی کادے کاٹنے۔ ایک دو مرتبہ نگاہ مشتاق سے دیکھا۔ ادھر بھی اثر ہوا۔ عمر کی خواہش۔ تنہائی کا تقاضا۔ رئیس خون۔ یہ بھی للچائی لیکن شرمائی نظروں سے دیکھنے لگے۔

عورت جتنا سہارا دے سکتی تھی اس نے دیا پر یہ اپنی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے اور ہوتے بھی کیونکر۔ پہلے پہل کا معاملہ ناتجربہ کاری۔ دل ابھارے جسم ساتھ نہ دے۔ یہ حضرت پتھر کا بت بنے بیٹھے رہے۔ شام ہونے آئی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ عورت کا بھی کوئی جاننے والا مل گیا۔ وہ ایک نگہ دعوت ڈالتی ہوئی رخصت ہوئی یہ بھی گھر کو آئے۔

آج یوسف کو تمام رات نیند نہ آئی۔ کروٹیں لیتا رہا۔ رہ رہ کر وہی عورت آنکھوں میں پھر جائے۔ بار بار دیکھنا یاد آئے۔ کبھی اپنی کم ہمتی پر لعنت ملامت کرے۔ کبھی دوسرے دن کی امید باندھے غرض کہ تمام رات آس و یاس میں گذر گئی۔ دن بھی

کسی نہ کسی طرح بسر ہوا۔ شام ہوتے ہی انہوں نے میرین ڈرائیو کا رُخ کیا اور اپنی جگہ جا سنبھالی۔ اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ آخر دور سے وہ کھلی موٹریں آتی نظر آئیں۔ دل تال بے تال دھڑکنے لگا۔ آنکھیں ان کی اجازت بغیر اُٹھیں اور جھکیں۔ خون کی روانی تلاطم خیز ہو گئی۔ موٹر ان کے سامنے رُکی وہ کافرادائی سے نگہ نہ بہ شکن ڈالتی اُتری۔ پائیدان پر پیر رکھتے ہوئے ساڑھی اتنی اُٹھالی کہ انہیں ساقِ بلوریں نظر آ گئی۔ آنکھ قدموں میں جا پڑی۔ اب اس نے اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا۔ کبھی سمندر کی سیر دیکھتی کبھی ٹریفک کی آر جار۔ اتنے میں ٹھنڈی ہوا سرسرائی اور مغرب کی جانب سے ایسی گھٹا اُمنڈ کر آئی جیسے البیلے جوان کا شباب۔ تقاطر شروع ہوا۔ بوندیں سمندر کے آغوش میں چھپتیں اور وہ مصروف رہنا خیز تھا۔

تھرمد موٹریں جا چھپیں ٹپ چڑھا دی گئی۔ یہاں بھی اپنی جگہ کسماتے۔ بادلِ ناخواستہ اُٹھے اور بس اسٹینڈ کی جانب قدم بڑھائے۔ اتنے میں بارش تیز ہو گئی۔ موٹر والی نے ڈرائیور کو بھیج کر بلا لیا۔ دروازہ بیگم نے خود کھولا کہا آپ کو کہاں جانا ہے۔ میں پہنچا دوں گی۔ راستہ میں باتیں ہونے لگیں۔ بارش کی وجہ سے موٹر چاروں طرف سے بند کر دی گئی۔ ہیئت تو اثر دامنی پر مائل تھی باران رحمت بہانہ بنا۔

اب سنیئے یہ بیگم بمبئی کی ایک طوائف تھیں۔ لڑکے پہ لٹو ہو گئیں۔ دل آیا اور ٹوٹ کر آیا۔ یہ اناڑی نادان بھی گرویدہ ہو گئے ——— پینگ بڑھتے گئے دن گذرتے گئے۔ تاہم یہ حُسن بازاری انجم کی یاد قلب سے محو نہ کر سکا۔ گاہ گاہ ایک ٹیس سی اٹھ جاتی اور پھر حافظہ کا قلم کار ماضی کے مرقع پیش کرتا۔ یوسف ایک دو روز کے لئے ملول و افسردہ ہو جاتا۔

ایک روز گجراتن دہی والی سر پہ ہنڈیا رکھے سامنے سے گذری۔ یوسف کی حالت خراب ہو گئی۔ ذہن کے آئینہ پہ کچھ پرچھائیاں سی گذریں اور دل کی دنیا تہ و بالا کر گئیں۔ رام دیئی نے سبب پوچھا۔ یوسف چھپا نہ سکا کچھ احتیاط برتی بعض چیزیں روک گیا۔ بعض کہہ دیں۔ دل پر غم امنڈ رہا تھا۔ نقوشِ ماضی اُبھر رہے تھے۔ انجم کے حصۂ داستان میں رام دیئی نے دلچسپی لی۔ یوسف کو بھی ذکرِ حبیب میں مزا آیا۔ یہ ٹکڑا بالتفصیل کہہ سنایا۔ رنڈی کی ذات ایک ایک بات ذہن نشین کر لی گئی۔

——— دہی والی کا واقعہ یہ تھا کہ انجم کی دوا اکثر ان کے سامنے ایک کہانی کہا کرتی تھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ایک شہزادہ تھا بیسوا کے پھندے میں پھنسا ہوا

تھا باپ نے لڑکے کی مرضی کے خلاف شادی کردی۔
شہزادی سسرال آئی تو سرتاج کا رنگ ہی دگرگوں پایا
حضرت رات کے ایک دو بجے لکھا بیسوا کے ہاں سے
تشریف لائیں تو اس شان سے کہ باہر خدام دربان،
پہرہ دار آواز لگائیں اندر قلماقنیاں ماماٸیں شور مچائیں
کہ دے گل کرو شہزادہ کی آنکھیں دُکھتی ہیں سیاں
کی اپنی یہ کیفیت کہ آنکھوں پر بیسوا کے ہاتھ کی پٹی
بندھی ہے ایک ملازم بسم اللہ بسم اللہ کرتا ہاتھ
پکڑے لئے چلا آتا ہے۔ اس پہ طرّہ یہ کہ نہ مُنہ سے
بولیں نہ سر سے کھیلیں۔ آئیں اور پائینتیوں پڑ جائیں
یہ شوہر کی عزت کے خیال سے خود بھی پائینتیوں
جا پڑے تو حضور سرہانے کا رُخ کریں۔ صبح اٹھ پھر غائب۔

عجب عذاب میں جان۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
شدہ شدہ شہزادی پہ بھید کھل گیا۔ عورت سب کچھ
جھیل لیتی ہے نہیں سہہ سکتی تو سوتیا ڈھا۔ سینہ میں
ایک خلش سی رہنے لگی۔ اوّل اوّل تو نئی دُلہن تھی
مُنہ پر قفل پڑا تھا کسی سے کچھ کہہ نہ سکی۔ آخر کچھ عرصہ
بعد ایک روز مہروہ بیگم کے ہاتھ بادشاہ کو کہلا بھیجا
کہ لونڈی کچھ عرض کرنا چاہتی ہے۔ وہ لولڑی کے
سہرے سے لائے تھے۔ پھر یہ بھی دیکھ رہے تھے
کہ کن حالات میں گزر کر رہی ہے اور اُف تک

نہیں کرتی۔ فوراً آئے۔ کہا بیٹا کیا بات ہے خیریت تو
ہے۔ بولی ابا جان ایک عرض کرنی چاہتی ہوں۔ کہا
بیٹا بخوشی کہو۔ بولی اگر جہاں پناہ اجازت دیں تو
لونڈی خود اپنا گھر پھیرنے کی کوشش کرے۔ شاہ
کی آنکھیں جھک گئیں۔ بولے بیٹا تم سے سخت شرمندہ
ہوں۔ کیا کروں اس اولاد کے آگے چلتی نہیں میں
تو اپنے سے سب جتن کر ہارا۔ میری طرف سے تم کو
پوری اجازت ہے۔ جو چاہو سو کرو شاید خدا کو
یوں ہی منظور ہو۔

بہو نے اجازت پاتے ہی پیک دوڑا دیئے کہ
پل پل کی خبر دیں۔ شہزادہ کس وقت کہاں ہے
اور کس وقت کہاں ——— ایک روز
اطلاع ملی کہ بیسوا کے ساتھ لال باغ میں شغل
مے نوشی ہو رہا ہے۔ یہ گجری کا بھیس بدل سر پہ
دہی کی ہنڈیا رکھ جا پہنچی۔ قریب پہنچکر آواز لگائی
'دہی لو دہی'۔ یہ سُریلی آواز شہزادہ کے کانوں سے
دل میں اُتر گئی۔ حکم دیا ہمارے سامنے پیش کرو۔
اب جو مکھڑا دیکھا تو چودھویں کا چاند۔ ہزار جان سے
عاشق ہو گیا ——— بیسوا تلملا رہی ہے
اپنی طرف رجوع کرنا چاہتی ہے لیکن یہ ہیں کہ چکور
بنے اُس ماہرو کو تک رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد

کرنے کے بعد شہزادہ نے شراب کی صُراحی اُدھر سرکائی اور کہا ایک جام اپنے ہاتھ سے پلا دو۔ یہ اُلٹ رہی تھی کہ بسوا نے پٹاری کچھ اس طرح گھسیٹی کہ صُراحی چھن سے ہوئی۔ شہزادی کی اُنگلی کٹی۔ خون بہنے لگا شہزادہ تڑپ اُٹھا۔ بولا ظالم غضب کیا۔ اپنے رومال سے خون پونچھا۔ اُنگلی باندھی۔ وہیں والی رخصت ہوئی شہزادہ نے پھر آنے کا وعدہ لے لیا۔

اب رات کو جو باوے سیاں گھر آئے تو وہی پرانا رنگ۔ شہزادی نے کراہنا شروع کیا اور بار بار کہے کیوں گئی تھی لال باغ۔ شیشہ ٹوٹا میرے ہاتھ اوئی میری اُنگلی ہائے میرا ہاتھ۔ اوّل تو شہزادہ آواز پہ چونکا پھر ان الفاظ نے اور بھی کان کھڑے کئے آخر جب نہ رہا گیا تو آنکھوں کی پٹّی کا کونا سرکا کر دیکھا چاندنی رات تھی ایک ہر کال چھپر کھٹ پر نظر آیا۔ پٹّی تھام اتار پھینکی۔ پیر پکڑ لئے ______ یہ کہانی دوا اکثر سُناتی اور گاہ گاہ انجم روپا کا لہنگا پہن چنیدری اوڑھ وہیں کی ہنڈیا سر پہ رکھ اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر پھرتی۔ اس وقت دوا کہتی میری شہزادی اپنا گھر بھیرنے جا رہی ہے۔

یوسف بولا رام دیئی اس نقش دوام کو بہلانا چاہتا ہوں پر شاید قبر میں لوح قلب پہ ساتھ لیجانا مقدر ہے۔ ع نقش ایسے بھی ہیں جو دل سے مٹائے نہ گئے

______ اتنا کہہ یوسف خموش ہو گیا۔

اِدھر تو یوں گزر رہی تھی۔ اب ذرا انجم اور روپا کی داستان سُنئے۔

عورت محبّت کا اثر زیادہ قبول کرتی ہے مرد سو دھندوں میں لگ کر بھول جاتا ہے۔ عورت دل سے لگائے رکھتی ہے۔ اس کی حیات محبّت ہے۔ اُس کا پیکر وفا۔ یہ خموش چنگاری اس حریم ناز میں سلگتی رہتی ہے اور ہونٹوں سے دُھواں تک نہیں نکل سکتا ______ انجم کو یہ خیال اور مارے ڈالتا تھا کہ یوسف کے گھرانہ پہ یہ تمام آفت اس کے باپ کے ہاتھوں آئی۔ گاہے ماہے اکیلے دُکیلے مُنہ لپیٹ کر آنسو بہا لیتی۔ ایک روز روپا آ گئی دوا نے وہی کہانی شروع کی۔ انجم کی نظریں تیسرے ساتھی کو ڈھونڈ رہی تھیں پیاسے ہرن کی طرح آنکھیں ہر چہار طرف جاتیں اور صحرائے یاس سے مایوس واپس آتیں۔ آخر دل بھر آیا اور انجم بہانہ کر اُٹھ گئی۔ روپا سایہ کی طرح ساتھ۔ دل کی پیاس بجھانے آنکھوں نے سوتیں کھول دیں اور انجم زار و قطار رونے لگی۔

______ آج روپا پہ کھلا کہ انجم کو یوسف سے کس درجہ محبّت تھی۔

ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز
و گرنہ عاشق و معشوق راز دار انند

سچے دوستوں کی ہمدردی رہینِ قیل و قال نہیں ہوتی۔ دونوں خموش بیٹھی رہیں۔ روپا پانی کا کٹورہ بھر لائی اور انجم کے سامنے رکھ دیا۔

ہر گریہ کا اشک آخر ہے اور ہر آہ کا ایک انجام انجم روتے روتے سو گئی۔ روپا بیٹھی سر دباتی رہی۔

یہ ساتھ بھی کچھ دن کا تھا۔ روپا کی نسبت آئی ماں باپ نے مہورت نکلوا لڑکی شبھ گھڑی پردیس بیاہ دی۔ سہیلیاں گلے مل مل کر روئیں اور روپا بھی سدھاری۔

اب انجم تھی اور غم تنہا۔

کسی نے سچ کہا ہے ساس نہ کر برائی تیرے بھی آگے جائی۔ چاہ کن را چاہ در پیش۔ یوسف کے باپ کو برباد کر کے نواب احمد علی خاں زیادہ عرصہ چین سے نہ بیٹھ سکے۔ اچانک فالج گرا۔ صاحب فراش ہوئے۔ تابڑ توڑ چند دورے پڑے عالم عمل ختم۔ اب ان کے اعمال تھے اور حساب۔

بیوی بھی میاں کے غم میں گھل گئیں پیٹھ میں پھوڑا نکلا معلوم ہوا سرطان ہے۔ پہلے یہ بات ان سے پوشیدہ رکھی۔ ایک روز کسی پھوہڑ ڈاکٹر نے مریضہ کے سامنے کہہ دیا۔ بس اُس وقت سے جو اُن کو چُپ لگی تو آخر وقت بچی کو گلے سے لگا کر اتنا کہا۔ خدا کے بھروسہ پر تمہیں چھوڑے جا رہی ہوں۔ ہمارے ہاتھوں نواب دولہا پر ظلم ہوا ہے۔ ہماری طرف سے تم یوسف میاں کی ہو چکی ہو۔ اگر تمہارے ہاتھوں کسی طرح تلافی ہو گئی تو ہمارے عذاب میں کمی ہو جائے گی اسکے بعد خود لیسین شریف پڑھی۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد تیسری ہچکی پر جان دیدی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

انجم کو دنیا اندھیر تھی چوبیس گھنٹہ روتے گذرتے پھپھی اماں یا پاکٹنی بھاوج کے مرتے ہی گھر میں آن بیٹھیں اور لگیں واری صدقہ جانے۔ انجم کو ان کی صورت بُری لگے ان کا یہ حال کہ دموں درانی۔ ساتھ ساتھ صاحبزادے صاحب میاں اختر بھی آنے جانے لگے اور لگے بہن بہن کر کے گھلو ٹھٹھو کرنے وہ منہ نہ لگائے یہ گھسے جائیں۔

ہماری انجم اُلھل کھری نہ تھی۔ پر اس کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی تھی کہ سارے فساد کی جڑ خاندان میں بگاڑ کی بنا یہ لنکا کی ترہی پھپھی جان ہی ہیں۔ چالیسویں تک تو یہ ٹس سے مس نہ ہوئیں ہاں اسکے بعد جب بھتیجی کو رخ دیتے ہوئے نہ پایا تو اتنا کہا کہ بیٹا میرا بھی گھر بار پٹ پڑا ہے ذرا وہاں بھی جھانک آؤں پھر جب تم بلاؤ گی میں آنکھوں سے آجاؤنگی۔

جان نگوڑی تو یہیں پڑی رہے گی۔ ہاں مجھے تم سے اتنا اور کہنا تھا کہ جائداد جاگیر کے معاملہ میں ان موئے دردغاؤں کا اعتبار نہ کرنا اللہ رکھے تمہارا بھائی اختر سارے کام جانتا ہے وہ سب سنبھال لیگا۔

انجم نے کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکائے بیٹھی سنتی رہی۔ دل میں تو ایک ایک بات کے ہزار ہزار جواب تھے پر کچھ کہہ نہ سکی۔ بہر نوع یہ جانتی تھی کہ ہوگا وہی جو میں چاہوں گی ان کو بھی اپنے دل کی کہہ لینے دو۔ اچھا ہے الفاظ میں دل کے راز معلوم ہو جاتے ہیں ——— انجم کا ارادہ تھا کہ روپا کے والد سکھ دیال جی سے مشورہ کرے اور امداد کی خواہاں ہو۔ سو ایسا ہی کیا۔ بڑے میاں نے کہہ دیا کہ بیٹی میں تجھ میں اور روپا میں فرق نہیں سمجھتا۔ بھگوان نے چاہا تو تیرا ایک پیسہ ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا ——— اس اللہ کے بندہ نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا۔

انجم کے پاس روپا کے خط متواتر آتے رہتے تھے جب سے اس کی منہ بولی بہن یتیم و یسیر ہوئی تھی اس وقت سے تو اس نے ڈاک بٹھا دی تھی اور برابر لکھ رہی تھی کہ کبھی آجاؤ۔ صورت دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ تمہارا بھی خیال بٹ جائے گا۔ ایک جو خط آیا اس میں شدید تقاضہ تھا۔ لکھا تھا کہ جس طرح ہو سکے چلی آؤ۔ ضروری باتیں کرنی ہیں کھانا وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پینا۔ اگر اب نہ آئیں تو سمجھنا بس کٹی ہو جائیگی میری بہن میری لاج رکھ لے۔ وہ کہتے ہیں اچھی سہیلی ہیں جو تمہارے اتنے کہنے پہ اپنی جگہ سے ہلتی نہیں کیا مجھے سسرال کے طعنے سنواتی ہو۔ نیز یہ بھی ذکر تھا کہ یہاں ہندو مسلمانوں کا جھگڑا ہو گیا تھا ہم پھنس گئے تھے قسمت سے بچ نکلے اب امن و امان ہے۔ ملنے کو دل تڑپ رہا ہے۔ تھوڑا لکھا بہت سمجھنا۔

روپا کا اتنا اصرار خالی از علت نہ تھا وہ ہوا یہ کہ روپا اپنے پتی کے ساتھ سکنڈ شو سے واپس آرہی تھی کہ بات بے بات پہ ہندو مسلم فساد ہو گیا ان کو خبر نہ تھی ایک بازار سے گذر رہے تھے کہ سامنے سے ہجوم غفیر آتا نظر آیا مجمع کی ذہنیت کا کچھ ٹھیک نہیں۔ دکانیں توڑ رہے تھے بلوا بپا تھا۔ چند بلوائی ان دونوں پہ پلٹ پڑے سامنے سے ایک شخص نوجوان لڑکھڑاتا چلا آرہا تھا اس نے مدد کی۔ مار پیٹ ہوئی۔ وہ تھا ہاتھ پیر کا اچھا ایک دو ایسے جم تول دئے کہ کائی سی کٹ گئی۔ روپا کا شوہر بھی ہنیا نہ تھا اس نے بھی کھیر لوپر ہاتھ مارے۔ ان کا مدعا لڑنا نہ تھا۔ بچ نکلنا تھا۔ مارتے ہوئے گلی میں گھس گئے۔

مردوں کے کپڑے پھٹ گئے تھے روپا کو دونوں نے بیچ میں لے لیا تھا وہ صحیح سلامت تھیں۔

روپا کے شوہر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور کہا مجھے رام دیال کہتے ہیں اور یہ میری دھرم پتنی ہیں۔ روپا نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ یوسف نے آنکھیں جھکا کر سلام لیا اور کہا میرا نام یوسف ہے غریب خانہ چند قدم پر ہے اگر آپ کوئی مضائقہ نہ سمجھیں تو تشریف لے چلیں کپڑے بدل لیں پھر سواری منگوا کر تشریف لے جائیں۔ اس نام پر روپا کے کان کھڑے ہوئے کنکھیوں سے چہرہ کی طرف دیکھا تو نقش و نگار پہچانی۔ ساتھ کے ساتھ سینہ پر نظر پڑی جو کپڑے پھٹ جانے کی وجہ سے عریاں تھا۔ جلا ہوا نشان صاف نظر آیا۔ یہ وہی نشان تھا جو بچپن میں انجم کی آگ بجھاتے ہوئے اس کے لگا تھا اور یہ اب تک اسے سینہ سے لگائے پھرتا تھا ——— روپا کا میاں جانتا تھا کہ شرابی ہے لیکن محسن سے انکار نہ کرسکا۔ نیز یہ بھی تجربہ کرلیا تھا کہ شریف ہے اور ہمدرد۔ ساتھ ہو لیا۔ گھر پہنچکر یوسف نے رام دیال کو اپنے کپڑے دیئے۔ ملازم سے چاء بنانے کو کہا۔ ساتھ کے ساتھ رام دیال سے یہ بھی کہا کہ میں مشکور ہوں آپ نے میری حالت کے باوجود مجھ پر بھروسہ کیا خصوصاً ایسی حالت میں کہ بہن بھی ساتھ تھیں

ایک گھنٹہ بعد کچھ فتنہ فرو ہوا اُنہوں نے ٹیکسی منگائی تینوں روانہ ہوئے۔ رام دیال کو گھر پہنچا یوسف نے اجازت چاہی اس نے کہا میں آپکو چھوڑ کر آؤں گا۔ یوسف ہنس کر بولا تو پھر تمام رات یونہی کٹ جائیگی۔ لیکن رام دیال کسی عنوان یوسف کو اکیلا بھیجنے پر راضی نہ ہوا۔ انجام کار روپا کے مشورہ پر یہ قرار پایا کہ یوسف رات وہیں گزارے۔ اب رام دیال کب چھوڑنے والا تھا لپٹ ہی تو گیا۔ اُدھر روپا نے الگ کمرہ میں پرتکلّف بستر لگوایا۔ ایک دو گھنٹہ یہ دونوں چاء پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ یہ سوال درمیان آیا کہ یوسف کے گھر ٹیلیفون کردیا جائے۔ تاکہ وہ لوگ پریشان نہ ہوں اس پر یوسف مُسکرا کر بولا میرا کوئی پریشان ہونے والا ہے نہیں۔

یہ مُلاقات کچھ ایسی ہوئی کہ یہ تینوں ایک دوسرے پر فدا ہونے لگے۔ روزانہ ایک دفعہ جب تک مل لیں قرار نہ آئے ——— یوسف دوستوں کا بھوکا تھا اسے تو جنت مل گئی۔ روپا بہنوں کی طرح خدمت کرے اس کا یہ حال کہ آنکھ اٹھا کر دیکھے نہیں۔ رام دیال اس کی شرافت کے روپا سے گیت گائے۔

ادھر روپا نے انجم کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا یوسف میاں بمبئی آئے ہیں۔ تم کو شاید خبر ہو۔ یہ پہلی

مرتبہ بھی جوان شرافت پہ ور دہ راز داروں کے درمیان یہ نام آیا۔ انجم کھٹکی۔ لکھ بھیجا کہ افواہ تو یہی ہے۔ یقینی کچھ نہیں معلوم۔

ادھر سے اطمینان کے بعد ایک رات رو پا نے اپنے میاں سے کہا کہ مجھے ان پر ہمارے پرانے یوسف بھائی کا شبہ ہوتا ہے گو میرا مدت سے ان سے پردہ ہو گیا تھا پر خدو خال بتاتے ہیں کہ یہ وہی ہیں ——————

گزشتہ تمام داستانیں، انجم اور یوسف کی نسبت کا حال پھر خاندانی تنازعات بیوی شوہر کو اتنی بار سنا چکی تھی کہ اب رام دیال اپنے کو بھی اس افسانہ کا ایک کیرکٹر تصوّر کرنے لگا تھا —————— انجم کا خط دکھایا۔ نیز یہ بھی بتایا کہ پہلے ہی دن میں نے ان کے سینہ پر جلا ہوا نشان دیکھا تھا۔ اب تم کسی دن اس کی بابت بھائی سے دریافت کر لینا۔

رام دیال بولا کہ اتنا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس شخص پر کوئی آفت پڑی ہے اور غم غلط کرنے کو شراب پیتا اور بھٹکتا پھرتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے جب اسے زیادہ پینے سے روکا تو غالب کا یہ شعر پڑھ دیا۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

ہاں مجھے تم سے یہ بھی کہنا تھا کہ یہ میاں ایک بار کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مجھے تو آج تک لیکر نہیں گئے عذر یہ ہے کہ پھر رو پا بہن کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جیسے آپ کے میاں نابالغ ہیں۔ انہوں نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں اور کہیں جاتے ہی نہیں۔ رو پا ترخ کر بولی کیا کہا۔ رام دیال نے بناوٹی گھبراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ میری مراد ہے کہیں جاتے ہی نہیں تھے۔ رو پا نے کہا۔ ہوں۔ اب یہ بات بنائی۔ سچی بات تو پہلے ہی زبان پر آ گئی۔

آخر دونوں کی رائے سے یہ طے پایا کہ کسی دن یہ دونوں دوست جو ہو جائیں۔ وہاں یوسف تیرنے کے لئے کپڑے اتارے ہی گا رام دیال حسن طریق سے پوچھ لیں۔

ایسا ہی ہوا۔ رام دیال بولا دوست یہ سینہ پر کس کا داغ لئے پھر رہے ہو۔ یوسف نے ایک آہ بھری اور یہ شعر پڑھا:۔

سینہ کو چمن بنائیں گے ہم
گل کھائیں گے گل کھلائینگے ہم

اور خموش ہو گیا۔

رام دیال نے کہا:۔

ہم سے نہ چھپا ظالم۔ ہم یار ہیں یاروں کے

یوسف سے بھی ضبط نہ ہوا ساری داستان کہہ سنائی۔

اب یہ دونوں میاں بیوی گٹھ گئے۔ قرار پایا کہ انجم سے مشورہ کرکے کوئی قدم اٹھایا جائے ——

خط پر خط جانے شروع ہوئے۔ کسی میں جان کی قسم کسی میں سر کی۔ کسی میں لکھا تھا کہ اگر نہ آؤ تو میرا جنازہ دیکھو۔ انجم اس کے بس۔ ایک پل نہ رک سکی۔ سامانِ سفر تیار کر ایک معتبر وارد غہ کو ساتھ لے بمبئی آن پہنچی۔ یہ دونوں سنٹرل پر موٹر لئے کھڑے تھے۔ سہیلیاں گلے ملیں۔ انجم کے واسطے شاہانہ طریق پر کمرہ تیار کیا گیا تھا نہ خرچ کرنے میں کمی کی تھی نہ خوش مذاقی میں ——

رو پا کے گھر عید تھی۔ رام دیال پھولا نہیں سماتا تھا ——

انجم برقعہ میں آئی تھی۔ رو پا نے کہا بہن میں وعدہ کرتی ہوں تمہارے دولہا کے سامنے ہوں گی تم بھی ان کے سامنے ہو جاؤ۔ شادی کے تخیل سے انجم کی ہونٹوں تک ایک نامعلوم آہ آئی اور رو پا کا محبت بھرا دل محسوس کر گیا۔

انجم کو آئے ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے اور یہ تینوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے جو ملازم نے آ کر کہا کہ یوسف صاحب تشریف لائے ہیں۔ انجم چونکہ پڑھی، میاں بیوی نظر بچا گئے۔ رام دیال باہر چلا گیا۔ رو پا بیٹھی رہی۔ دونوں سہیلیوں کے دل میں اس وقت ایک ہی بات تھی لیکن مہر سکوت

برلب رو پا شرارت سے کچھ نہ کہے۔ انجم شرم کے مارے چپ۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں دلی میں سب خیریت ہے۔ تمہارے والد نے بہت مدد کی۔ اب بھی سارا کام انہی کے حوالہ کرکے آئی ہوں میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی ——

رو پا نے بمبئی کے ذکر اذکار چھیڑے۔ ایسا خوبصورت شہر ہے۔ آج شام کو اپولو چلیں گے۔ گرین میں جائے پئیں گے۔ میں نے موٹر چلانی سیکھ لی ہے ہم تم موٹر لئے پھرا کریں گے۔ ان کو فرصت ذرا کم ہوتی ہے۔ مجھے سارے راستے معلوم ہیں تم فکر نہ کرو۔ ہزاروں باتیں کرنے کے باوجود رو پا کا ذہن خالی معلوم ہوتا تھا اور بس ایک ہی بات دل و دماغ پر چھائی تھی —— آخر اس سے نہ رہا گیا اور ساری داستان کہہ سنائی۔ پھر بولی ایک نظر تم بھی دیکھ لو۔ مجھے تو یقین ہے مزید اطمینان کے لئے تصدیق چاہتی ہوں۔

انجم کسمسائی۔ لیکن رو پا کے اصرار سے پردہ کے پیچھے سے جھانکا۔ دیکھتے ہی لڑکھڑا گئی۔ یوسف تھا اور اسی کا یوسف۔ نقش و نگار وہی تھے لیکن آثار کچھ اور۔ چہرہ پر گردش روزگار نے اپنے نشان چھوڑے تھے اور آلام نے خراشیں۔ تیوڑے

جُھک گئے تھے دیکھیں بدل گئی تھی بچپن کی نرمی افکار زدہ جوانی کی سختیوں سے بدل چکی تھی۔ عمارت وہی تھی لیکن گرم وسرد روزگار نے رد و کار بدل دی تھی —— روپا انجم کو سہارا دے تھی۔ انجم کے پاؤں زمین نے پکڑ لئے۔ وہ اپنی ہستی کو بھولی کھڑی تھی۔

یوسف نشہ میں چور رام دیال سے کہہ رہا تھا کہ اچھا ہوا اس وقت بہن یہاں نہیں آسکیں ورنہ مجھے شرمندہ ہونا پڑتا۔ بھائی میں اس حالت میں تمہارے گھر ہرگز نہ آتا لیکن دل نہ مانا۔ چاہتا تھا کہ ایک دفعہ پھر مِل لوں۔ یہ خیال کشاں کشاں لے آیا۔ بہن کو میری طرف سے خدا حافظ کہہ دینا۔ اتنا کہہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا ادھر انجم ڈگمگائی۔ یہاں روپا نے سہارا دیا وہاں رام دیال نے زبردستی بٹھا لیا اور کہا۔ آخر بات کیا ہے —— بولا بالتفصیل کہنے کو دل ودماغ نہیں۔ بس یوں سمجھو کہ میں بربادی کی آخری منزل سے گذر رہا ہوں اور اپنا منحوس سایہ تمہارے گھر پہ ڈالنا نہیں چاہتا خدا تمہیں خوش وخرم رکھے۔ اس سے پہلے کہ یوسف اُٹھے دوست نے کندھے پہ ہاتھ رکھ لیا اور کہا جب تک ساری بات نہ سُن لوں گا جانے نہیں دوں گا۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ملازم نے آکر کہا کہ فرم کے ڈائرکٹرز کی میٹنگ ہو رہی ہے آپکا انتظار ہے جواب ملا کہدو اس وقت میں نہیں آسکتا۔ ملازم نے پھر آکر کہا وہ کہتے ہیں چاندی کا بھاؤ گر رہا ہے جو خریدی ہے اسے بیچنے کا سوال درپیش ہے آپ کی موجودگی جلسہ میں ضروری ہے۔ یوسف بولا۔ کیوں نہیں جاتے۔ رام دیال نے مُسکرا کر اسے دیکھا اور کہا یوسف میرا کئی دن گھوٹا ہوا جا رہا ہے انکو چاندی کی پڑی ہے۔ رام دیال دوست کا بھوکا ہے پیسہ کا نہیں ملازم کو پھر وہی حکم دیا گیا کہ کہدو ہم نہیں آسکتے پھر یوسف کی طرف رجوع ہو کر پوچھا اب بتاؤ معاملہ کیا ہے۔

یوسف نے کہا بھیّا میں گردن تک غرق ہو چکا ہوں۔ اب ہاتھ پیر مارنے بیکار سمجھتا ہوں اس لئے ڈوب ہی جاؤں تو بہتر ہے۔ ایک عرصہ سے رام دُلی مُصر ہے کہ میں اپنی جائداد اس کے نام منتقل کر دوں کہتی ہے تم شرابی ہو تمہارا کیا اعتبار۔ خدا معلوم کہاں گنوا بیٹھو۔ پھر میرا کیا ہوگا۔ تمہارے نام پڑی بیٹھی ہوں —— میں نے بھی سوچا پوری طرح برباد ہو کر دیکھوں شاید پھر کچھ سکون ملے۔ ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

علاوہ بریں اب میرا ہے کون جس کے لئے اپنے کو بچانے کی کوشش کروں۔ مجھ جیسے تعلق بُریدہ لوگ اپنی زندگی سے جو کھیل سکتے ہیں سو میں بھی کھیل لوں گا۔ جانتا ہوں وہ دغا کرے گی لیکن یہ تماشہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں ـــــــ نیز اب زیادہ کشمکش ہو نہیں سکتی۔ دل ہاتھ پیر ڈالے دے رہا ہے ـــــــ کسی امید پر انسان تزلزلِ حیات برداشت کرتا ہے ـــــــ کسی سہارے پر ابنِ آدم سیلابِ زیست میں پابرجا رہتا ہے۔ نہ یہاں اُمید نہ سہارا اب بہہ جانے میں مزا ہے سو کل ہم ساری جائداد اس کے نام منتقل کر دینگے پھر ہم سبکدوش ہیں وہ خود سب انتظام کر لے گی مجھے جائداد کی دیکھ بھال کرنی آتی بھی نہیں۔ بھلا مجھے ان کاموں سے کیا واسطہ۔ اسکے بڑے سب صاحب جائداد تھے۔ وہ ان کاموں سے بھرپور واقف ہے ـــــــ یہ کہہ کر یوسف مُسکرایا۔ اور یہ تبسّم دہانِ زخم کا سا تھا۔

رام دیال :۔ کیا انسان کو کبھی کرمِ خداوندی سے مایوس ہونا جائز ہے؟

یوسف :۔ نہیں۔

رام دیال :۔ پھر تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟

یوسف : میں اپنے کو دھوکہ دے رہا ہوں۔

رام دیال :۔ کس لئے؟

یوسف :۔ اس میں ایک لذّت ہے۔ بھنور میں پھنسا ہوا ہاتھ پیر مارنے کے بعد ہاتھ پیر چھوڑ دینے ہی میں راحت محسوس کرتا ہے ـــــــ مار گزیدہ جانتا ہے کہ سویا اور مرا۔ پھر بھی سو جاتا ہے ـــــــ شرابی جانتا ہے کہ ہر جام لغزشِ قدم بڑھا دیگا لیکن پیئے جاتا ہے۔ یہی حال میرا ہے۔

رام دیال :۔ میری ایک بات مانو گے؟

یوسف :۔ بے شک۔

رام دیال :۔ پندرہ دن کے لئے انتقالِ جائداد ملتوی کر دو۔ پھر جو تمہارا دل چاہے سو کرنا۔

یوسف :۔ اچھا۔

رام دیال نے یوسف کا لٹکا ہوا ہاتھ ہاتھ میں لے لیا تھوڑی دیر دونوں دوست غم و وفا کا مجسّمہ بنے بیٹھے رہے۔ ہونٹ بند تھے۔ سینوں میں طوفان۔ زبانیں ساکت تھیں۔ دل صَرفِ گفتگو۔

آخر یوسف اُٹھا۔ رام دیال نے پھر کہا پندرہ دن۔ جواب ملا بے فکر رہو۔

یوسف کے جانے کے بعد انجم ڈگمگاتی ہوئی چلی اُس کی حالت اُس آتش زدہ درخت کی سی تھی جو ابھی

سلگ رہا ہو اور اندھیاؤ چل پڑے۔ پیروں تلے سے زمین سرکی جارہی تھی۔ دماغ معطل ہوگیا۔ فرنیچر کا سہارا لیتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی اور کرسی پر شور زدہ دیوار کی طرح ڈھے گئی۔

روپا قریب بیٹھی تھی مگر خموشش۔ یہ غم رہینِ گفتار نہ تھا۔

رام دیال نے کمرہ کے باہر سے دیکھا اور اپنے میں اس غم خموش میں دخیل ہونے کی جرأت نہ پائی ______ لیکن مرد تھا اور رفتارِ زمانہ سے واقف۔ جانتا تھا کہ پندرہ دن اب گذرے جو کچھ کرنا ہے کر گذرو۔ سب مہروں سے واقف تھا اور اپنی بساط مطابق بازی لڑانے پر آمادہ۔ جانتا تھا کہ انجم یوسف کے دل کی ملکہ ہے۔ اس مہرہ کو قرینہ سے چلانا چاہتا تھا۔ شاطر دماغ راہیں سوچنے نقشے بنانے لگا۔ معلوم تھا کہ یوسف رام دئی کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے۔ رُخ دیکھ کر کام کرنا ہوگا۔

آخر روپا کو آواز دی۔ میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھے اور تدابیر سوچنے لگے۔ بیوی نے شوہر کے پاؤں پکڑ کر کہا۔ تم نے میرے دوست کی خاطر اپنا نقصان کیا۔ میں داسی ہوں۔ شوہر بولا۔ دیوانی مجھے روپیہ کا لوبھ نہیں ہے۔ دس بیس ہزار کا نقصان میں اُٹھا سکتا ہوں۔ اب تو یہ بتا کہ ان دونوں کو کس طرح ملایا جائے۔ اگر یوں ہی سامنے کر دیا تو میں نہیں کہہ سکتا کامیابی ہوسکے نہ ہوسکے۔ صحیح کہ یوسف کو اب تک انجم کا خیال ہے لیکن ولیشیا کا جال بھی کڑا جال ہے اور یوسف اب بھرپور پھنس چکا ہے۔ تم نے سُن لیا ساری جائداد اُس کے نام منتقل کرنے کو تیار ہے۔

روپا:۔ ہماری انجم کے آگے وہ ہے کیا چیز۔ ایک نظر اسے دیکھ کر پھر اُدھر کا رُخ بھی نہیں کریں گے۔

رام دیال:۔ تو دیوانی ہے رنڈی کی ریشہ دوانیاں جانتی نہیں۔ یہ مکڑی کی طرح مرد کو پھانستی ہے اور وہ مکھی کی طرح نکلنا چاہتا ہے اور نہیں نکل سکتا۔ مانا کہ انجم صورت شکل میں بے مثل ہے لیکن پردہ ستر کی پلی شرم و حیا والی رنڈی کا توڑ نہیں کرسکے گی۔ شراب کا جواب شربت نہیں ہوسکتا ہم کو شربت ایسا رنگنا ہوگا۔ فضا ایسی مخمور کرنی پڑے گی ماحول اتنا پُرکیف بنانا ہوگا کہ شربت شراب معلوم ہو اور پہلے ہی وار میں بیڑا پار ہوجائے۔

روپا:۔ یہ باتیں تو تم جانو۔ میں کوئی افسانہ نگار تو ہوں نہیں۔ پر کوئی صورت پیدا کرو جو یہ گھر بس جائے۔ ہے دونوں کو ایک دوسرے سے محبت۔

انجم شرم کے مارے نہیں کہتی۔ یوسف مایوس ہو چکا ہے۔

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ رام دیال کو افسانہ نگاری کا شوق تھا۔ کالج کے زمانہ میں اکثر رسالوں میں بھیجتا رہتا تھا اور اب بھی فرصت کے لمحات اسی شغل میں گذارتا تھا۔

اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ میزبانوں نے مہمان کو بلایا۔ کھانا چنا گیا۔ ابھی یہ بیٹھے ہی تھے کہ گجراتن دہی والی ہنڈیا سر پہ رکھے آن پہنچی۔ انجم نے ایک نظر دیکھا اور سکتہ کے عالم میں رہ گئی۔ آنسو آنکھوں میں جم گئے۔ آہ لب پر۔ روپا تاڑ گئی۔ رام دیال بھی یہ کہانی روپا کے منہ سے واقعات کے ساتھ سن چکا تھا۔ سمجھ گیا۔ روپا کو اشارہ کیا وہ دہی والی کو الگ لے گئی۔ ملازم سے کہا دہی خرید لو۔ اب یہ تینوں کھانا تو کھا رہے ہیں لیکن دلوں کا وارث اللہ ہی ہے۔ انجم ایک مشین کی طرح نوالہ منہ میں رکھ رہی ہے۔ حافظہ کے پردۂ سیمیں پر تصویریں آ رہی ہیں اور جا رہی ہیں ——— روپا سر جھکائے روٹی توڑتی ہے۔ گوشۂ نگاہ انجم پر ہے ———

رام دیال کا افسانہ نگار دماغ نقشہ جما رہا ہے اسے ان دونوں کی کچھ خبر نہیں۔ ذہن کا جُلاہا ملن عنوان سے تانے بانے بُن رہا ہے۔ چہرہ پہ بشاشت ہے۔ آنکھوں میں چمک۔ روپا دیکھ رہی ہے اور تعجب کر رہی ہے۔ کھانا ختم ہونیکے بعد رام دیال اپنے کمرے میں چلا گیا۔

روپا انجم کو پان دیکر سوامی کے لئے لے کر گئی تو دیکھا بیٹھے بڑے شد و مد سے لکھ رہے ہیں۔ اس نے کہا کیا لکھا جا رہا ہے۔ جواب ملا ملن۔ اس نے پوچھا کس کا۔ بولا انجم اور یوسف کا۔ کہا ہمیں بھی تو بتاؤ بغیر سر اونچا کئے بولا اس وقت چلی جاؤ۔

لکھنا ختم کر رام دیال نے روپا کو بلایا اور کہا میں نے دہی والی کا قصہ ڈرامہ کی شکل میں لکھا ہے اب یہ تمہارا کام ہے کہ انجم کو اس میں پارٹ کرنے پہ رضامند کر لو۔ یوسف کو میں بلا لوں گا۔ چند احباب جمع ہوں گے۔ یوسف پہلی مرتبہ انجم کو اسٹیج پہ دیکھے گا۔ ماضی کے نقوش تڑپا دیں گے۔ کام بن جائے گا۔ اس سے بہتر تدبیر ہو نہیں سکتی یہ خدا کی طرف سے ہے نہ اس وقت دہی والی آتی نہ میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوتا۔

اِدھر ان میاں بیوی نے مل انجم کو راضی کیا ڈرامہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اُدھر یوسف نے رنڈی سے کہہ دیا کہ پندرہ دن بعد دیکھا جائیگا۔

اب یہاں کی تو یہاں چھوڑو۔ پندرہ دن بعد دیکھا جائے گا۔ ذرا پھپی اماں کی خبر لیجئے کہ وہ پٹنگ

چھری کس حال میں ہیں اور اُن کے صاحب زادہ میاں اختر کس رنگ میں۔

انجم کی بمبئی کے ارادہ کی خبر اُن سے چھپ سکتی نہ تھی۔ گھر کی ایک دو نمک حرام مامائیں انہوں نے ملا رکھی تھیں۔ اس پر خود بھی دوسرے تیسرے خیریت منگا لیتیں۔ آٹھویں ساتویں بھائی جان تشریف لے جاتے۔ غرض کہ اِدھر تو جانے کی تیاریاں شروع ہوئیں اُدھر پھپی اماں کو بھنک پہنچی۔ یہ انہیں پہلے سے علم تھا کہ یوسف اور اس کے والد بمبئی سدھارے ہیں۔ بڑھیا کو سناٹا ہی تو آ گیا۔ لگی منصوبے سوچنے۔ آخر یہی سوجھی کہ کہیں سے روپیہ بٹور کر بیٹے کو بمبئی بھیجے تاکہ وہ خبر رکھے۔ اور جو کچھ بن پڑے سو کرے۔

جس ٹرین سے بی انجم خیر سے بمبئی سدھاریں اسی سے بد طالع اختر بھی روانہ ہوا —— بمبئی کے اسٹیشن سے ٹیکسی ساتھ لگا لی اور ردیا کا گھر دیکھ لیا اور لگا وہاں کے کاوے کاٹنے۔ دیکھتا کیا ہے کہ میاں یوسف چلے آ رہے ہیں۔ یہ پہچان کر پیچھے ہو لیا۔ وہ یہاں سے سیدھے رام دئی کے ہاں پہنچے۔ اِس نے پتہ کر لیا کہ رنڈی کا گھر ہے رات کو گانا سُننے جا پہنچا۔ یوسف تو روزانہ آتا ہی تھا دونوں میں سلام دُعا ہوئی۔ مدتوں بعد ملے تھے کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔

رنڈی یوسف کو قدرے اکھڑا اکھڑا پا رہی تھی اس نے سوچا کہ شاید اختر سے کچھ بھید معلوم ہو لگی اس کی جانب التفات کرنے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مفاد دونوں کے ایک تھے منٹوں میں گھل مل کر گٹھ گئے اور لگے تدابیر سوچنے۔ اختر نے انجم کا سارا حال کہہ سُنایا۔ رام دئی نے سوچا کہ اسی روز سے یوسف کی نظریں بدلی ہوئی ہیں۔ طوائف کا دماغ برق رفتاری سے کام کرنے لگا اختر سے کہا کہ انجم کی کوئی تصویر منگا دو۔ اس نے ماں کو لکھا کہ انجم کی ایک تصویر جو ہیم سے کھچوائی گئی تھی اور جس کی ایک کاپی بھائی نے بہن کو دی تھی وہ فوراً رجسٹرڈ کر کے روانہ کر دیں۔

تصویر ملتے ہی ایک ماہر فن مُصوّر کے ہاں جا پوری پوری رقم ادا کر اختر نے اپنے پہلو میں بیٹھا ہوا بنوا لیا۔

اُدھر تصویر تیار کی جا رہی تھی۔ اِدھر ڈرامہ تیار ہو گیا —— ایک روز ردیا اور رام دیال نے اپنی شادی کی سالگرہ منائی اور اس سلسلے میں یہ ڈرامہ کھیلا گیا۔ تھوڑے سے قریب کے عزیز جمع کئے۔

یوسف میاں بھی آئے۔ تماشہ دیکھ سب تو چلے گئے لیکن یہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ منہ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں بُت سا بنے بیٹھے ہیں۔ روپا اور انجم مجنوں میاں کو پردے کے پیچھے سے دیکھ رہی ہیں۔ آخر روپا باہر آئی اور کہنے لگی۔ بھائی دیر ہو رہی ہے آپ جاتے کیوں نہیں۔ یوسف کے چہرے پر خون دوڑ رہا تھا دل میں موجِ مسرّت۔ ہنسکر بولا فقیر کا کہاں ٹھکانا جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے ــــــ بھائی بہن میں بڑی دیر تک چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ رام دیال بھی شریک ہو گئے۔ یوسف ہر آہٹ پر چاروں طرف نظریں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے۔ عین مایوسی میں اُمید کی صورت نظر آئی تھی۔ اب یہ دامن کب چھوڑنے والے تھے۔ آخر سارا ماجرا انہیں بتا یا گیا۔ بولے اب تو ہم دھونی رمائے بیٹھے ہیں اس در سے مُراد لے کر ٹلیں گے۔ آخر رات گئے اپنے گھر سدھارے۔ صبح ہی پھر موجود تین چار دن اسی طرح گذرے۔ اُدھر رام دئی نے جب بالکل ہی اپنے ہاں سے غائب پایا تو تلملا گئی ــــــ تصویر تیار ہو چکی تھی پہلے تو بلانے کے واسطے آدمی بھیجے جب سنائی نہ ہوئی تو ایک روز سویرے سویرے ہی خود جا پہنچی یہ رام دیال کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے اس لئے اِصرار کر کوٹریں بٹھالیا اور اپنے گھر لے آئی ــــــ طاق میں تصویر رکھ چھوڑی تھی۔ یوسف کی نظر پڑی تو جم کر رہ گئی۔ دیوانہ وار اُٹھا لایا۔ رنڈی سوکھے منہ سے بولی کل ایک صاحب یہاں بھول گئے تھے میں نے طاق میں رکھ دی سوچا جب بھی آئیں گے لیجائیں گے عاشق و معشوق معلوم ہوتے ہیں۔

اب جو یوسف نے شراب کی بوتل اُٹھائی تو اس وقت ہاتھ سے رکھی جب اُٹھ ہی نہ سکی ــــــ گرا اور کچھ ایسا گرا جیسے جڑیں کٹ جانے کے بعد درخت گرے۔

یہاں شُرب دوام تھا وہاں انتظار پیہم۔ انجم کی نظریں بار بار دروازہ پر جاتیں۔ روپا اور رام دیال پریشان۔ گھر پر دریافت کیا تو پتہ نہیں ــــــ آخر دوست دوست کی خاطر رنڈی کے ہاں پہنچا ــــــ بزنس میں افسانہ نگار دماغ بسائے پہلو سوچ کر گیا تھا وہاں بھی چوکنا رہا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ یوسف کو دیکھا کہ ایک طرف چارپائی پر دھت پڑا ہے۔ شراب کی خالی بوتلیں نیچے لڑھک رہی ہیں۔ جب ہوش آتا ہے تھوڑی سی اور چڑھا جاتا ہے ــــــ رام دیال یہ تو سمجھ گیا کہ دلشیا نے کچھ نہ کچھ چال چلی ہے۔ لیکن کیا داؤں

کیا ہے۔ کس طرح یوسف کو انجم سے پھیر دیا ہے یہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

ایک روز باتوں باتوں میں رام دئی سے بولا دوست آج تم سے ایک صلاح کرنی ہے۔ اکثر عورت کا دماغ وہ بات پیدا کرتا ہے جو مرد کے فرشتوں کو بھی نہیں سوجھتی۔ اگر کوئی کام کی صلاح دو تو جو مانگو سو دوں اور عمر بھر احسان مانوں سو الگ۔ رنڈی بولی بتائیے کیا بات ہے۔ رام دیال نے کہا ہمارے کنبہ کی ایک لڑکی کو ایک آوارہ منش نوجوان نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ شادی کروں گی تو اسی سے۔ ہم لوگوں کو یہ رشتہ کسی طرح منظور نہیں۔ وہ شخص بہت برا ہے فقط پیسہ کی خاطر اسے پھانس رہا ہے۔ ماں باپ کی اکلوتی ہے اور سارے مال و متاع کی وارث۔ ہم سب جتن کر ہارے ظالم نے کچھ ایسا جادو کیا ہے کہ کوئی عمل کارگر ہی نہیں ہوتا۔ رنڈی نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آپ اس لڑکے کی تصویر لے آیئے۔ میں ایک فوٹوگرافر کو جانتی ہوں وہ ایک تصویر کے پہلو میں دوسری تصویر کو اس طرح بٹھا دیتا ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا لڑکی کو تصویر دکھائیگا اور بتائیگا کہ ایک طرف تو تجھ سے محبت جتا رہا ہے دوسری طرف یوں رنگ رلیاں اڑا رہا ہے۔ منٹوں میں پلٹ جائے گی۔ یوسف کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ ان میاں کو یہی انجکشن دیا گیا ہے۔ دیکھئے کس حال میں پڑے ہیں اتنا کہہ رنڈی انجم اور اختر کی بنائی ہوئی تصویر اٹھا لائی۔ بولی یہ لڑکی کی تصویر الگ تھی اسے لڑکے کے ساتھ چسپاں کیا گیا ہے۔ رام دیال نے کہا یہ تصویریں لئے جاتا ہوں کل تک واپس کردوں گا۔ میرے اپنے بھروسہ کا جو تصویر والا ہے اسے دکھا لوں۔ رام دئی نے دینے سے انکار کیا اس نے ہزار ہزار کے دو نوٹ حوالہ کئے اور کہا یہ ضمانت ہے کل تک واپس آجائے گی ــــــ

رنڈی نے گلے میں ہاتھ ڈال کر رخسار سے رخسار ملا کر کہا۔ مجھے کب انکار ہے۔ ادھر یوسف انگڑائی لیکر اٹھا شراب ہوچکی تھی۔ رام دئی کی جانب بڑھا اسے اس حال میں پایا۔ مردکے ایک تھپڑ مارا دیکھا تو رام دیال ایک قدم پیچھے ہٹا۔ پھر کہا دوستی کے یہی معنی تھے۔ رام دیال کا کام بن گیا تھا۔ یہاں مزید بات کرنے کا موقع نہ تھا وہ تو سیدھا ہولیا۔ رنڈی اچنبھے میں رہ گئی کہ یہ ایک دوسرے کے دوست کیسے۔ جب تک وہ کچھ سمجھ سکے رام دیال

جا چکا تھا اور یوسف جا رہا تھا۔ طوائف نے دامن
پکڑ لیا۔ یوسف نے دھکا دیا منہ پہ تھوکا۔ اور
سیدھا ہو لیا۔

رنڈی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہ تھی۔
دوسرے ہی دن گھر جا پہنچی۔ یوسف غم کی آگ
آپ آتش دار سے بجھا رہا تھا۔ عقل کا اندھا طوفان
الم کو بوتل کے بند پانی سے دبانا چاہ رہا تھا۔ رنڈی
کو دیکھتے ہی کہا میرے سامنے سے نکل جا۔ میں
تیری صورت دیکھنی نہیں چاہتا لیکن اس صورت
سے وہ نکلنے والی تھی نہیں۔ شراب زدہ نے اپنا
فرض انجام دے دیا۔ زبان تک بھی قابو تھا
اس سے کہہ دیا —— شراب اور پی آنکھیں
چڑھ گئیں۔ حقائق پہ پردے پڑ گئے۔ رنڈی نے موقع
سے کام لیا۔ جام پہ جام بھر کر دیا۔ پھر جائداد کا سوال
درمیان لائی۔ یوسف بے اختیار ہنسا ——

اس دیوانہ کی سی ہنسی جسے دنیا دیوانہ کہے اور وہ
دنیا کو دیوانہ جانے۔ پھر مخمور آواز میں بولا ویشیا
تو مجھے مدہوش سمجھ رہی ہے۔ دیوالی آفتوں نے
میری آنکھیں کھول دی ہیں تجھے ہوس نے اندھا
کر رکھا ہے —— مصیبتوں کے چراغ
مجھے روشنی دکھا رہے ہیں۔ تیرے دل و دماغ پہ
لوبھ کی اندھیاری چھائی ہے —— سن
اور کان کھول کر سن۔ اب میری جائداد میں سے
ایک پیسہ بھی تو نہیں لے سکتی —— بیوقوف
مایوس ہو گئی۔ ایک شرابی نے تیری ساری چالوں
پہ پانی پھیر دیا —— ادھر دکے کھلونے گزشت
کی گڑیا تو مرد کو بیوقوف نہیں بنا سکتی۔ وہ ہوا اس
کھو کر بھی تیرے بس میں نہیں آ سکتا تو ہر وقت اس
کے بس میں ہے —— اتنا کہہ رام دئی کو گود
میں اٹھا دیوار کے قریب لے گیا اور کہا۔ بول
ٹکرا ٹکرا کر مار دوں —— پھر ہنسا ——

اس دیوانہ کی سی ہنسی جو دشمن کے گلے پہ ہاتھ رکھ کر
اپنے شکار کو بنظر رحم دیکھے اور کہے دے دیوانگی کو
دعا جو تجھ پہ رحم کر رہی ہے کوئی فرزانہ تجھے نہ چھوڑتا۔

رام دئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یوسف بولا ڈر گئی۔
زندگی کی بھوکی موت سے ڈر گئی۔ ناگن انسان کے
پیر تلے آ کر تلملا رہی ہے۔ ابھی کچھ عرصے ڈسنے کی
اور تمنا ہے۔ جاہل حقیقت فراموش تو مرد کو نہیں
ڈس سکتی۔ وہی تیرے ڈنک مار رہا ہے۔ تو اس کا
مال لیتی ہے۔ اس کی جان لیتی ہے۔ وہ تیری عزت
لیتا ہے۔ اندھی جوارن تو مہنگا سودا کر رہی ہے۔
اتنا کہہ رام دئی کو پھینک دیا۔ اسکے سر میں

چوٹ آئی ـــــــ یوسف پھر ہنسا ـــــــ اُس دیوانہ کی سی ہنسی جو کسی بیمار کو دیکھ کر کہے کہ دماغ کی بیماری۔ عقل کی بیماری سب سے بڑی بیماری ہے۔ میں اس میں مبتلا ہوں اور خوش ہوں پھر تو کیوں روتا ہے۔

یوسف زمین پر اس کے قریب ہو بیٹھا اور بولا تجھے اپنے زخموں کے لئے مرہم چاہئے۔ جا کل میں اپنی جائداد تیرے نام کر دوں گا۔ لیکن یاد رکھ تجھے خوش کرنے کو نہیں۔ لذّتِ غم بڑھانے کے لئے۔ اب جا کل دس بجے آئیو ـــــــ کیچن کندن لے جائیو۔

رام دئی کو آس بندھی۔ وہ یوسف کے قریب سرکی یہ بولا۔ مجھے مت چھو تو گندی ہے۔ میں بھی گندہ تھا لیکن مصیبت کی آگ میں تپ کر اب ستھرا ہو گیا ہوں ـــــــ مجھے یہ آگ عزیز ہے اور بھڑکانے کے لئے اس بھٹی میں اپنے تہ ال تک جھونک رہا ہوں رزق تک ڈالے دے رہا ہوں۔ جا آلودہ حیات چلی جا۔ تو دولت کی بھوکی ہے۔ میں غم کا پیاسا۔

رام دئی چلی گئی۔ یوسف نے پھر پینی شروع کی ملازم نے آکر کہا رام دیال آئے ہیں۔ یوسف کے ہاتھوں میں تشنجی کیفیت پیدا ہوئی دانت پیس کر اور گھونسہ بنا کر اٹھا پھر بیٹھ گیا۔ نوکر سے کہا ہم پر باہر سے کھٹکا لگا دو۔ ہم اندر سے بند کر لیں گے اور اس سے کہہ دو کہ ہم نہیں مل سکتے ـــــــ ملازم نے ذرا توقف کیا۔ بولا جاؤ جو ہم نے کہا ہے ویسا کرو۔

ملازم رام دیال کو اپنے آقا کا سچا دوست جانتا تھا سب کچھ بیان کر دیا اور جو باتیں رام دئی سے ہوئی تھیں وہ بھی کہہ دیں۔

رام دیال سخت پریشان گھر پہنچا۔ بیوی پروانہ کی طرح گرد پھرنے لگی۔ مُنہ سے کچھ نہ بولے دل میں چھاج لگے ہوئے۔ رام دیال پہلے تو خود سوچتا رہا۔ آخر شریکِ حیات کو سب کہہ سُنا یا دونوں سر پکڑ کر ہو بیٹھے۔ آخر رام دیال بولا رو پا اب تجھے اس کام میں میرا ہاتھ بٹانا ہو گا۔ یوسف نے ہماری عزّت بچائی تھی اس وقت وہ ہمیں جانتا بھی نہ تھا اب ہم دوست ہیں۔ میں بدلہ صرف اس شکل میں ادا کر سکتا ہوں کہ اپنی عزّت اس کے لئے خطرہ میں ڈال دوں۔ رو پا نے کہا میں لونڈی ہوں جو حکم ہو۔ آخر یہ طے پایا کہ رو پا کسی طرح یوسف کے گھر جائے اور کہے کہ جاندنی کو (؟) سخت نقصان ہوا۔ اُس روز ٹیلیفون تمہارے سامنے ہی آیا تھا۔ وہ گئے نہیں بھاؤ گر گیا۔ اب

قرضخواہ گھر گھیرے بیٹھے ہیں تم لاج بچا سکتے ہو اپنی جائداد پر منڈیوں کی آڑ کر لو۔ ہم مہینہ بھر میں سب ادا کر دیں گے ——— رو پا پھر عورت ذات تھی بولی وہ نشہ میں ہیں۔ رام دیال نے جواب دیا لیکن شریف ہے۔ شراب سوائے شرافت کے اور سب جو ہر دبا سکتی ہے۔

روپا موٹر میں گئی۔ یوسف نے دروازہ کھولا۔ اس نے سب معاملہ بیان کیا۔ یہ اور اٹھ بیٹھے۔ پانی سے نہایا۔ کانوں میں تیل ڈالا۔ سر پر پوشاک کی کپڑے پہن قبالے بہن کے ساتھ ہو لیا۔

یہاں رام دیال نے کچھ جاننے والے مارواڑی کچھ منعم اکٹھے کر رکھے تھے۔ یوسف نے رام دیال سے بات نہیں کی۔ ساہوکاروں نے جو کارروائی چاہی کر لی اس نے قبالہ سامنے ڈال دئے۔ منہ سے اتنا کہا کہ ان کی منڈیوں کی آڑ کرنے کو میں تیار ہوں۔

ہاتھ جھاڑ گھر آ گیا۔ دو روز بعد روپا پہنچی اور کہا بھیا چلو کھانا وہیں کھانا۔ یوسف پی رہا تھا۔ ہنسا اور بولا بہن یہ گھر آپ کے آنے کے قابل نہیں مجھے شرمندہ نہ کیجئے میں کھانا کھا لوں گا۔

... روز اسی حالت میں گزر گئے۔ یوسف کو بلانے کے سب جتن ... وہ اپنی جگہ سے ٹس سے

... نہ ہوا کہ راکھی بندھن کا تہوار آ یا۔ روپا اور رام دیال نے اسے تاشہ غنیمت سمجھا۔ بہن نے بھائی کو لکھ کر بھیجا کہ آج سب بہنیں بھائیوں کے راکھی باندھ رہی ہیں۔ میں ایسی کم نصیب ہوں کہ بھائی کے ہوتے تہوار نہیں منا سکتی۔ میں آنکھوں سے آتی پر پھیر لو۔ پوجا کا سامان سب یہاں ہے۔ اگر بھائی کو بہن کی ذرا سی بھی لاج ہے تو ابھاگن بہن چرن چھو کر کہتی ہے کہ دس منٹ کو آ جاؤ۔ میں اپنا فرض ادا کر لوں۔

یوسف یہ خط دیکھ کر رک نہ سکا موٹر منگوا فوراً بہن کے گھر جا پہنچا۔ رام دیال اور روپا پوجا کا سامان لئے بیٹھے تھے۔

روپا نے بھائی کے راکھی باندھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ گنگا جل چھڑکا ـــ روپا نے کہا بھائی تم جانتے ہو یہ کیا ہے۔ یوسف نے کہا گنگا جل۔

دھرم پتنی نے پگڑی اپنے سوامی کے سر پر رکھ دی اور بھائی کا ہاتھ پکڑ کھڑی ہو گئی۔ رام دیال نے ان حالات میں ساری داستان دوہرائی۔ کہا ثبوت میں وہ تصویر میرے پاس موجود ہے۔ ولیشیا نے تمہارے ساتھ جل کیا

ہیں تمہارے بچانے کو خود پھنسا۔ تم کو بدگمانی ہوئی۔

یوسف سر جھکائے رام دیال کی طرف بڑھا رام دیال نے گلے لگا لیا۔ روپا نے آنسوؤں کے موتی برسائے۔

اب یوسف کی پیاسی آنکھیں کسی اور کی متلاشی تھیں ——— عورت سمجھ گئی۔ روپا انجم کے پاس گئی۔ وہ بیگم بگڑی بیٹھی تھیں۔ صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ مجھے اب ان سے کچھ واسطہ نہیں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی تھی پر انہوں نے کیا سمجھ کر مجھ پر بدگمانی کی کیا میں شریف نہیں ہوں۔

یوسف اور رام دیال دوسرے کمرے میں سے یہ باتیں سن رہے تھے یوسف دیوانہ وار اٹھا اور انجم کے پیر پکڑ لیے۔

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

ہوس کا تازیانہ لے چلا انساں کی چوکھٹ پر
مری دنیا میں بندہ کے خدا ہونے کا وقت آیا
غروب آفتاب قلب سینہ میں مبارک ہو
نماز عشق میں سجدہ ادا ہونے کا وقت آیا

روپ متی

افرادِ تمثیل

باز بہادر۔ نوعمر سجیلا جوان

روپ متی۔ پیکرِ حسن، باز بہادر کی معشوقہ

رام داس — روپ متی کے خود ساختہ ماں باپ

پاربتی — باز بہادر کے حرم کی ایک عورت

سجنی۔ باز بہادر کے حرم کی ایک عورت

شہنشاہ اکبر۔

ادھم خاں۔ اکبر کا دودھ شریک بھائی (کوکہ)

ماہم اناگا۔ اکبر کی انّا

درباری امرا، سپہ سالار، خدام و خادمات وغیرہ

سین نمبر ۱

شکار گاہ۔ باز بہادر کا کیمپ، رات کا وقت، جگہ جگہ آگ کے گرد سپاہی بیٹھے شکار بھون بھون کر کھا رہے ہیں۔

باز بہادر کے خیمہ میں خوان نعمت چنا ہے ہم نوالہ و ہم پیالہ ملیح و صبیح نوخیز لڑکیاں لطف طعام دو بالا کر رہی ہیں۔ جام چل رہا ہے۔ رقاصہ گردش میں ہے ناچتی ہوئی ایک ایک پاس جاتی ہے اور حسب حال شعر سناتی ہے۔

گانا۔ ۵ تمہارا چاندنی راتوں میں آنا یاد ہے مجھ کو
زمانہ ہو گیا پر وہ زمانہ یاد ہے مجھ کو

ایک جانب دامن حسن دست عاشق میں ہے معشوق جھٹکا دے کر چھڑانا چاہتی ہے وہ مسک جاتا ہے۔

معشوق۔ (بگڑ کر) تم بڑے وہ ہو ہمارے ٹکڑے کر دیے

عاشق۔ (لجاجت سے) بگڑو نہیں پیاری! بیٹھ جاؤ۔ تم کو ہمارے سر کی قسم ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔

رقاصہ ان کے قریب آ کر گاتی ہے۔

مرا تسمیں لا کر مجھ کو پہلو میں بٹھا لینا
تسلی دیتے دیتے اپنے سینے سے لگا لینا
زمانہ ہو گیا پر وہ زمانہ یاد ہے مجھ کو

ایک جانب پیر نود سالہ معشوق چاردہ سالہ سے اظہار عشق فرما رہے ہیں،
رقاصہ ناچتی ہوئی آتی ہے۔

مری محفل میں کچھ بٹتی تھی شراب ارغوانی کی
بڑھاپے سے یہاں ہو جاتی تھی لغزش جوانی کی
زمانہ ہو گیا پر وہ زمانہ یاد ہے مجھ کو

ایک طرف دست شوق حد ادب سے آگے بڑھ رہا ہے حسن اپنے کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ رقاصہ پہنچ جاتی ہے۔

مری گستاخ نظروں سے چھپانا اپنے جوبن کو
وہ شبنم کے دوپٹہ میں چھپانا سارے گلشن کو
وہ تیری سعی لاحاصل وہ میرا مدعا حاصل
مرا جوش جنوں واللہ ہر تقصیر پہ مائل
نگاہیں جھپی جھپی کچھ پسینہ تیرے ماتھے پہ
غضب تھا وہ ترا دست تاسف تیرے ماتھے پہ
زمانہ ہو گیا پر وہ زمانہ یاد ہے مجھ کو

ایک عاشق دیوانہ کسی مست شباب کو گود میں بٹھائے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا ہے۔ رقاصہ ان کے پاس آ کر گاتی ہے۔

مری محفل میں ساقی تھا نہ ساغر تھا نہ پیمانہ

جوانی دوش پر اپنے لئے پھرتی تھی میخانہ

سین نمبر ۲

چھوٹا سا مکان، کسی لڑکی کے دو خوبصورت پاؤں ہم کو نظر آ رہے ہیں، ان کے قریب ایک بڈھا اور بڑھیا بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، بڑھیا لڑکی کے ناخنوں پر مہندی لگا رہی ہے۔

بڈھا۔ میں ایک قافلے کے ہمراہ صحرا میں سفر کر رہا تھا۔

ریتیلے میدان میں اونٹوں کی ایک قطار چلی جا رہی ہے۔ گھنٹیاں بج رہی ہیں، آندھی آ گئی چلی جا رہی ہے۔ آندھیاں اٹھتا ہے۔ قافلہ تتر بتر ہو جاتا ہے۔ اونٹوں کے پیر اکھڑ جاتے ہیں ساتھی بچھڑ جاتے ہیں۔ ایک ماں اپنی بچی کو کلیجہ سے لگائے ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے لڑکی پیاس سے بلبلا رہی ہے، ماں کا دودھ خشک ہو چکا ہے، بپتا کی ماری نیم مردہ حالت میں ریت پر گر پڑتی ہے۔

ماں۔ (بچی کو محبت بھری نگاہ سے دیکھ کر) ماں تجھے جلتی ریت پر چھوڑ کر جا رہی ہے، پالن ہار تجھے راج کرائے سنگھاسن پر بٹھائے۔

اپنی اسد کھی ہوئی زبان بچی کے منہ میں دیتی ہے کہ شاید رتی رائی لعاب دہن سے اس کا حلق تر ہو اور اس ہی حالت میں دم دیتی ہے ادھر عورت کی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ ادھر طوفان رک جاتا ہے۔ یہ بڈھا اس جگہ پہنچ جاتا ہے۔ لڑکی کو اٹھا کر چھاگل میں سے پانی پلاتا ہے۔

دور ایک فقیر گا رہا ہے۔

مقدر کی خبر کس کو مقدر کی خبر کس کو
کبھی ہے تخت شاہی اور کبھی ہے زہر کا پیالہ
یہ دنیا ہے نہیں اک حال پہ ہرگز قرار اس کو
مقدر کی خبر کس کو۔ مقدر کی خبر کس کو

پھر وہی لڑکی کے پیر ہیں اور بڈھے بڑھیا بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

بڈھا۔ یہ موتی مجھے خاک میں پڑا ملا تھا۔

بڑھیا۔ یہ موتی تاج شاہی کے قابل ہے۔

بڈھا۔ میں نے اس کو میووں کے عرق اور دودھ پر پالا ہے۔ چاند میں داغ ہے اور اس میں داغ نہیں۔ ان انگلیوں نے اس جسم کی یوں اس طرح مالش کی ہے کہ ہر عضو یدن سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے یہ روپ مندر کی دیوی ہے۔

بڑھیا۔ مندر دیوی سے اور دیوتا پجاری سے۔

بڈھا۔ میری نگاہ تو باز بہادر پر ہے۔

بڑھیا۔ تیری نگاہ نے خطا نہیں کی۔
بڈھا۔ کل کیمپ میں لیجا کر اس انمول موتی کو پیش کروں گا۔
بڑھیا۔ تیری نگاہ نے خطا نہیں کی۔
بڈھا۔ کل کیمپ میں لیجا کر اسی انمول موتی کو پیش کرونگا۔
بڑھیا۔ قیمت گھٹ جائیگی آبرو خاک میں مل جائیگی۔
بڈھا۔ کیوں؟
بڑھیا۔ تو [illegible] ہے۔
بڈھا۔ مطلب؟
بڑھیا۔ لے اور ملا میں بڑا فرق ہوتا ہے،
بڈھا۔ تو پہیلیاں کیوں بوجھواتی ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتی۔
بڑھیا۔ گھر بیٹھے دولت مل جائے اسے انسان گنوا دیتا ہے، گھر بیٹھے عورت مل جائے اسے مرد ٹھکرا دیتا ہے۔
بڈھا۔ سمجھا پھر کیا کیا جائے۔
بڑھیا۔ باز بہادر اس طرف شکار کھیلنے آیا ہوا ہے ہم اس کو شکار کرینگے۔ یا قسمت یا نصیب۔
بڈھا۔ تو نے کیا تدبیر سوچی ہے۔

سامنے دیوار پر رادھا جی کی تصویر لگی ہے۔ ایک پاؤں پتھر پر رکھے سارا بدن جھکائے عجیب دلفریب انداز سے کانٹا نکال رہی ہیں۔

بڑھیا۔ (اس تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے) کیسی موہنی ہے۔
بڈھا۔ میں پوچھتا ہوں تو نے ترکیب کیا سوچی ہے اور تو مجھے تصویر دکھا رہی ہے۔
بڑھیا۔ دل کے آئینہ پر پہلا عکس آخری عکس ہوتا ہے۔ اگر یہ باز بہادر کے سامنے اس ادا سے آئے تو اس کے پیر کا کانٹا اسکے دل میں چبھ جائیگا۔
بڈھا۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔
بڑھیا۔ کوشش سے کیا نہیں ہو سکتا۔ شکار جنگل میں کھیلا جاتا ہے اور جنگل میں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔
بڈھا۔ اس کے پاؤں میں کانٹا لگانا ہوگا۔ اس کے دکھ ہوگا
بڑھیا۔ دکھ کے بعد سکھ ہے۔ سرمہ پس کر خاک ہوتا ہے تب آنکھوں میں جگہ پاتا ہے، پھول کانٹوں میں پل کر گلے کا ہار ہوتا ہے۔ شاہی سیجوں پر پہنچنے سے پہلے کانٹوں کے بستر پر گذارنی پڑتی ہے۔

سین نمبر ۴

باز بہادر تیر و کمان کے لئے ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالے چلا جا رہا ہے۔ تیر چلاتا ہے ہرن زخمی

ہو کر گھنے جنگل میں گھس جاتا ہے۔ باز بہادر پاپیادہ پیچھے ہولیتا ہے، ڈھا اور بڑھیا روپ متی کو لئے تاک میں کھڑے ہیں ایک طرف باز بہادر چلا جارہا ہے دوسری طرف یہ انسان کے شکاری اپنا لاسہ لئے گھات لگائے چلے جارہے ہیں۔

اب ایک ہاتھ روپ متی کے پیر میں کانٹا گھسارہا ہے۔ ہاتھ غائب ہو جاتا ہے۔ باز بہادر دوڑتا ہوا اس طرف آتا ہے روپ متی پہ نگاہ پڑتی ہے۔ وہ ایک بُت کی طرح کھڑی ہے۔

باز بہادر۔ گل بدن کے پیر میں کانٹا۔

روپ متی۔ پھول کانٹوں ہی میں پلتا ہے۔

باز بہادر۔ کیا میں یہ نکال سکتا ہوں؟

روپ متی۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔

باز بہادر۔ (ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر کانٹا نکالتے ہوئے) شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے۔

روپ متی۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔

باز بہادر کانٹا نکالتا ہے۔ روپ متی سسکاری بھرتی ہے۔

باز بہادر۔ کیا تکلیف ہو رہی ہے۔

روپ متی۔ تکلیف کے بعد راحت ہے۔

باز بہادر۔ (کانٹا نکال کر) کیا میں یہ رکھ سکتا ہوں۔

روپ متی۔ کیوں۔

باز بہادر۔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔

روپ متی۔ پھول نہیں تو کانٹا ہی سہی۔

روپ متی چلنا چاہتی ہے۔ لڑکھڑاتی ہے باز بہادر اس کو گود میں اٹھالیتا ہے۔

باز بہادر۔ (چلتے ہوئے) اس ہرنی کا رمنا کہاں ہے۔

روپ متی۔ شکاریوں سے دور۔

باز بہادر۔ اس دیوی کا مندر کہاں ہے۔

روپ متی۔ پجاریوں سے دور...... مجھ میں بوجھ ہے۔

باز بہادر۔ بہت۔

روپ متی۔ آپ تھک جائیں گے۔

باز بہادر۔ بے شک۔

روپ متی۔ مجھے اتار دیجئے۔

باز بہادر۔ ہرگز نہیں۔

روپ متی ایک خاص ادا سے باز بہادر کی طرف دیکھتی ہے۔

باز بہادر۔ تم میں بوجھ ہے، میں تھک جاؤنگا .... تم اگر میری ہم سفر ہو تو زندگی کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

روپ متی۔ ہاتھ تھک جائیں۔ شانہ شل ہوجائیں
پیر لڑکھڑانے لگیں۔۔۔۔۔ آپ مجھے کہاں لئے جارہے ہیں۔
باز بہادر۔ ندی کنارے۔
روپ متی۔ کیوں۔
باز بہادر۔ اپنے اور تمہارے زخم دھونے۔
روپ متی۔ آپ بھی زخمی ہیں۔
باز بہادر۔ ہاں۔
روپ متی۔ کہاں۔
باز بہادر۔ (دل پر ہاتھ رکھ کر) یہاں۔

باز بہادر ندی پر پہنچ کر روپ متی کو پتھر پر
بٹھا دیتا ہے اور اس کا پاؤں دھو کر باندھ
دیتا ہے۔

روپ متی۔ میں احسان مند ہوں۔ شکریہ ادا
کرتی ہوں۔
باز بہادر۔ زبانی جمع خرچ، زبانی شکریہ۔
روپ متی۔ (قدرے بگڑ کر) میں
احسان فراموش نہیں ہوں۔
باز بہادر۔ احسان اتاروگی۔
روپ متی۔ اپنی سی کوشش کروں گی۔
باز بہادر۔ ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا۔
روپ متی۔ جھوٹ۔ روپ متی جھوٹ نہیں بولا کرتی۔

باز بہادر۔ روپ متی۔ روپ متی۔ کتنا پیارا
نام ہے۔
روپ متی۔ اب اپنا بھی تو زخم دھو لیجئے۔
باز بہادر۔ یہ زخم آنسوؤں سے دھویا جاتا ہے۔
روپ متی۔ یہ مرہم ہمارے پاس نہیں۔
باز بہادر۔ اس زخم سے آپ واقف نہیں۔
روپ متی۔ اچھا اب ہمیں گھر پہنچا دیجئے۔
باز بہادر۔ ہماری مزدوری دیجئے۔
روپ متی۔ گھر چل کر دیدوں گی۔
باز بہادر۔ اونہوں۔ کھری مزدوری چوکھا کام۔
روپ متی۔ پر یہاں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔
باز بہادر۔ ہم بتائیں، آپ ہم کو گانا سنا دیجئے۔
روپ متی۔ چہ خوش۔
باز بہادر۔ آپ کی خوشی بیٹھی رہیئے۔
روپ متی۔ مجھے گانا نہیں آتا۔
باز بہادر۔ مجھے چلنا نہیں آتا۔
روپ متی۔ ایسا بھی کوئی ہے جسے
چلنا نہ آتا ہو۔
باز بہادر۔ ایسا بھی کوئی ہے جسے
گانا نہ آتا ہو۔

آخر کار روپ متی مجبور ہو کر گاتی ہے

گانا

دو پہریا میں جھگڑا مچائے سوراراجہ
دو پہریا میں جھگڑا مچائے سوراراجہ
نکتہ چیں ہے غم دل اسکو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
دو پہریا میں جھگڑا مچائے سوراراجہ
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
دو پہریا میں جھگڑا مچائے سوراراجہ

گانے کے بعد باز بہادر روپ متی کو گود میں اُٹھا کر چلنا شروع کرتا ہے۔

روپ متی۔ آپ کا نام کیا ہے۔

باز بہادر۔ روپ داس۔

روپ متی۔ جھوٹ۔

باز بہادر۔ سچ۔

روپ متی۔ کرتے کیا ہیں۔

باز بہادر۔ روپ کی پوجا۔

روپ متی۔ سچ سچ بتائیے۔

باز بہادر۔ میں مالوہ کے بادشاہ باز بہادرؔ کی فوج میں افسر ہوں۔

روپ متی۔ باز بہادر کیسا آدمی ہے۔

باز بہادر۔ وہ ایک انسان ہے۔

روپ متی۔ کیا مطلب۔

باز بہادر۔ مطلب یہ کہ انسان میں بھلائیاں بھی ہوتی ہیں۔ بُرائیاں بھی۔ اسی طرح باز بہادر میں خوبیاں بھی ہیں خرابیاں بھی۔

روپ متی۔ سنا ہے وہ شراب بہت پیتا ہے۔

باز بہادر۔ ہاں بہت پیتا ہے، دن رات پیتا ہے پر تم کو یہ بھی معلوم ہے کیوں۔

روپ متی۔ نشہ کے لئے۔

باز بہادر۔ نہیں اس لئے پیتا ہے کہ دنیا کا چھل دھوکہ اور چھل اس کو نظر نہ آئے۔ ؎

اِک گونہ بیخودی اسے دن رات چاہیئے

روپ متی۔ سُنا ہے کہ گاتا بھی اچھا ہے۔

باز بہادر۔ سچا ہے سچے سُر لگاتا ہے، دل کی لگی سُروں سے بجھاتا ہے۔ تنہا روح کی چیخ کو راگوں کی آواز میں چھپاتا ہے۔

روپ متی۔ سنا ہے اس کے ہاں عورتیں بہت ہیں۔

باز بہادر۔ ہاں ہیرے کی تلاش میں پتھر جمع کرتا رہتا ہے اور کرتا رہے گا۔ یہ مشغلہ مایوسی سے بہتر ہے۔

اب روپ کا گھر آجاتا ہے۔ باز بہادر دروازہ

کھٹکھٹاتا ہے۔ بڈھا کواڑ کھول کر باہر آتا ہے
روپ متی کو باز بہادر کی گود میں دیکھ کر
افروختہ خاطر سا بن جاتا ہے۔

بڈھا۔ ہائے غضب۔ اری او پاربتی، آج عزّت خاک میں مل گئی، چھوڑ دو جی میری کنیا کو۔

باز بہادر۔ یہ چل نہیں سکتی۔

بڈھا۔ کیوں۔ کیا مر گئی۔

باز بہادر۔ ان کے پاؤں میں کانٹا لگا ہوا ہے۔

اتنے میں بڑھیا آ جاتی ہے۔

بڑھیا۔ ہائے میری بچی کو کیا ہو گیا۔ اندر لے آؤ جی۔

بڈھا۔ ہائے غضب عزّت خاک میں مل گئی۔

بڑھیا۔ تمہیں عزّت کی پڑی ہے۔ میرا کلیجہ نکلا جاتا ہے۔

سب اندر کی طرف جاتے ہیں۔

بڈھا۔ (باآواز بلند) یہ دن بھی دیکھنا تھا جس کے چہرہ پہ کسی مرد کی آنکھ نہیں پڑی تھی آج اسکو غیر مرد گود میں اٹھا کر لایا ہے۔ روپ تو مر جاتی تو اچھا تھا۔

باز بہادر روپ متی کو پلنگ پہ لٹا دیتا ہے۔
بڑھیا پاؤں کی پٹی کھولتی ہے۔

بڑھیا۔ (زخم دیکھ کر) ہائے اتنا بڑا گھاؤ۔ یہ کیسے بھرے گا۔

باز بہادر۔ میرے پاس ایک مرہم ہے۔ جو آپ کہیں تو میں کل لے آؤں۔

بڈھا۔ تم کوئی وید حکیم ہو۔

باز بہادر۔ جی نہیں۔ ہم تو سپاہی ہیں گھائل ہونا ہمارا روز کا کھیل ہے۔ جیسے جیسے مرہم ہمیں یاد ہیں کسی کو معلوم نہیں۔

بڈھا۔ بس بس رہنے دو اپنے مرہم۔ ہم کو نہیں چاہئیں۔

بڑھیا۔ میں گلا گھونٹ کے مر جاؤں گی۔ میں جان دے دوں گی۔ ہائے میری بچی کا گھاؤ بن مرہم کے سڑے گا۔

روپ متی۔ اماں مجھے مرہم منگا دو۔

بڈھا۔ جاؤ چولھے میں تم دونوں۔ جو چاہو سو کرو۔

بڑھیا۔ بیٹا بھگوان تیرا بھلا کرے۔ کل مرہم ضرور پہنچا دیجو۔

باز بہادر۔ کل پہنچ جائیگا۔

باز بہادر پرنام کر کے چلا جاتا ہے۔

سین نمبر ۴

شہر میں سے باز بہادر کے دو مصاحب گذر رہے ہیں ہر شخص مغموم سا نظر آتا ہے، سارے شہر پہ افسردگی چھائی ہے۔ مدہم بروگ رس میں باجہ بج رہا ہے۔ یہ دونوں محل کے صدر دروازے پہ پہنچتے ہیں۔ پہرہ دار سر جھکائے کھڑے ہیں اندر مینا بازار میں دوکاندار پژمردہ سے بیٹھے ہیں ایک دوکان پر خوش الحان پرندے ہیں، لیکن منقار زیر پر۔

پہلا مصاحب۔ آج ہر چیز افسردہ کیوں ہے،

دوسرا مصاحب۔ رعایا راجہ کے دل و دماغ کی آئینہ دار ہے۔ راجہ خوش۔ پرجا خوش۔ راجہ رنجیدہ پرجا مغموم۔

پہلا مصاحب۔ طبع عالی کیوں گراں ہے۔

دوسرا مصاحب۔ کچھ دل کا معاملہ ہے۔

پہلا مصاحب۔ دل کا کیا معاملہ ہے۔

دوسرا مصاحب۔ دل کا معاملہ دل ہی جانے۔

ان مصاحبوں کے پیچھے پاربتی اور بڈھا چلے آرہے ہیں۔

بڈھا۔ ابھی سے کیوں چل رہی ہے کچھ دن اور کھینچ۔

بڑھیا۔ رسّی کو اتنا نہ کھینچ کہ ٹوٹ جائے۔

بڈھا۔ کچھ دن آگ اور بھڑکنے دے۔

بڑھیا۔ مورکھ اتنا نہ سلگا کہ راکھ ہو جائے۔

بڈھا۔ تیری مرضی۔

یہ دونوں مصاحب باغ میں سے گذرتے ہیں پھول کُملائے ہوئے ہیں۔ سرو جھکے کھڑے ہیں فوّارہ میں سے ایک ایک بوند پانی کسی غمزدہ کے آخری آنسوؤں کی طرح ٹپک رہا ہے۔

اب یہ دونوں باز بہادر کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں مصاحبین جمع ہیں۔ باز بہادر کے سامنے جام شراب رکھا ہے۔

باز بہادر۔ (جام کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے) یہ پانی غم روزگار دل سے دھو دیتا ہے، لیکن دل کی لگی پر تیل کا کام کرتا ہے۔

ایک طرف مُطربہ دو تارہ لئے بیٹھی ہے اس سے مخاطب ہو کر۔

باز بہادر۔ سناؤ۔ کوئی بروگ رس میں ڈوبی ہوئی چیز سناؤ۔

گاتا

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی — کیسے کے بھر لاؤں مدوا سے مٹکی
عالم ہو میں اک آواز سی آجاتی ہے — چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

بہت کٹھن ہے ڈگرپن گھٹ کی
پیتم جو ہیں جانی کہ پیت کرے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹنی کہ پیت کرے نا کوئے
بہت کٹھن ہے ڈگرپن گھٹ کی
بشہرِ عشق ندانم چہ فتنہ برپا شد
کہ قاصد آمد و آہے کشید و ہیچ نگفت
بہت کٹھن ہے ڈگرپن گھٹ کی
کوئی ہمدم مرے ہمراہ مرے دوش بدوش
دو قدم چل نہ سکے گا مجھے معلوم نہ تھا
بہت کٹھن ہے ڈگرپن گھٹ کی

نقیب آتا ہے۔

نقیب ۔ رام داس اور پاربتی قدم بوسی کے خواہاں ہیں۔

باز بہادر کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے۔

باز بہادر ۔ حاضر کئے جائیں۔

بڈھا اور بڑھیا سامنے آکر متھا ٹیکتے ہیں۔

باز بہادر ۔ اُٹھو رام داس، تم بھی اُٹھو، پاربتی کیا بات ہے۔

رام داس ۔ اَن داتا ہماری تقصیر معاف کر دیجئے۔

باز بہادر ۔ کیسی تقصیر

پاربتی ۔ اسے معلوم نہیں تھا اَن داتا۔

رام داس ۔ مہاراج راجہ کی خوشی پرجا کا فرض ہے روپ متی داسی ہے جو حکم ہو۔

باز بہادر ۔ (ان دونوں مصاحبوں کی طرف مخاطب ہوکر) ان کے ساتھ جاؤ اور ہماری امانت کو لے آؤ۔

یہ لوگ جس راستے سے آئے تھے اُدھر ہی سے واپس جاتے ہیں۔ سرو سر اٹھائے کھڑے ہیں پھول پھولے نہیں سماتے۔ فوارہ اُبلا پڑتا ہے۔ اس دُکان کے سامنے سے گزرتے ہیں جہاں پرندوں کے پنجرے لٹک رہے تھے۔ اب ان کی آوازوں سے بازار بھر گونج اٹھا ہے۔ شہر میں ہر چہار طرف چہل پہل ہے۔ ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آتا ہے۔

باجہ بہت شوخ بج رہا ہے۔ دور سے گانے کی آواز آتی ہے۔

گانا

ڈھپ باجو رے آج ڈھپ باجو رے
ڈھپ کی گرج موہے سب گھر بارے
ڈھپ باجو رے آج ڈھپ باجو رے
ہنکار دو آج خوب چلو میکدے کو ذوق
چھوڑو کہیں وظیفہ بہت بڑے بڑا اچھلے

ڈھپ باجورے آج ڈھپ باجورے
محفلِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں
ڈھپ باجورے آج ڈھپ باجورے

سین نمبر ۵

باز بہادر اپنے محل میں روپ متی کے پاس بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔

روپ متی۔ آج حضور کیا سوچ رہے ہیں۔
باز بہادر۔ ایک پہیلی کی بوجھ۔
روپ متی۔ یہ لونڈی سن سکتی ہے۔
باز بہادر۔ بے شک۔

ریت تمہاری جگ سے نیاری   چکر میں نر ناری
تخت پہ بیٹھیں ڈھونڈیں وہ   بن مانگے مل جائے بھوکوں کو

روپ متی۔ یہ وہ دیا ہے جس سے سنسار روشن ہے جس سے دنیا میں اُجیالا ہے، اس پہیلی کی بوجھ چکور کے چکر میں ہے۔ بلبل کے نالہ میں شبنم کے آنسو میں۔ پروانہ کی تڑپ میں۔ ماں کی ممتا میں۔ استری کی قربانی میں۔ یہ چیز سنسار میں ہر جگہ ہے۔
باز بہادر۔ ہر جگہ ہے پر میرے پاس نہیں۔
روپ متی۔ عالی جاہ۔ یہ دولت دھن دولت سے نہیں ملتی۔ پریم پریم سے جیتا جاتا ہے۔ دل کا سودا دل دے کے ہوتا ہے۔
باز بہادر۔ روپ تم میری ہو۔
روپ متی۔ عورت کا جسم دولت سے خریدا جا سکتا ہے۔ پریم ان داموں نہیں ملتا۔

باز بہادر روپ متی کو اپنے محل کے خوبصورت مرمریں مجسمے دکھاتا ہے اور کہتا ہے۔

باز بہادر۔ روپ ایسے ایسے حسین بُت میرے محلوں میں ایک دو نہیں ہزاروں ہیں۔ لیکن سرد ہیں سرد مہر ہیں، ان میں پریم کی بو نہیں اور میرا دل دیوانہ محبت کی آگ کا پروانہ ہے۔
روپ متی۔ عورت کا جسم بغیر محبت کے بجھی ہوئی شمع ہے جس سے اندھیرے دل میں اجالا نہیں ہو سکتا۔
باز بہادر۔ اور نہ پروانہ اپنی لگی بجھا سکتا ہے روپ! میں ان ٹھنڈی گرمیوں سے سیر ہو چکا لَو سے لَو لگانی چاہتا ہوں۔
روپ متی۔ پہلے اپنے ہردے میں پریم کی اگنی سلگاؤ۔
باز بہادر۔ اچھا روپ جسم تو بہت جیتے۔ اب من کی بازی جیتیں گے۔

سین نمبر ۶

دربار اکبری آراستہ ہے۔ تخت شاہی کے

سامنے زرنگار پردہ پڑا ہے۔ اہل دربار حسب
مراتب دست بستہ کھڑے ہیں۔

نقیب۔ باادب۔ ہوشیار۔ نگہ روبرو۔ قدم
بہ نگہ۔ نگہ بر قدم۔ باادب ہوشیار۔ جم جاہ۔ عالم پناہ
ستارہ سپاہ۔ شہنشاہ ہند۔ ظل سبحانی۔ لطف ربانی
صاحبقران ثانی۔ مہابلی بر آمد ہوتے ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے۔ شہنشاہ اکبر جلوہ افروز ہیں۔
دربار پر سکوت کا عالم ہے۔

وزیر۔ مالوہ سے اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ
وہاں کا حاکم باز بہادر شہباز عشق کے پنجہ مردافگن
میں گرفتار سلطنت سے بے خبر شب و روز مصروف
عیش و نشاط ہے۔ رعایا کی حالت تباہ ہے۔
جابر عمّال دست تعدی دراز کر رہے ہیں۔ شہنشاہ
ہند کی طبع انصاف پسند پر یہ امر گراں ہے۔ بدیں وجہ
ادہم خاں کو کہ پنج ہزاری کو بہمراہی پنج صد زنجیر
پیل و سپاہ لشکر شکن اس طرف روانہ کیا جاتا ہے۔
اقبال بلند ہو، جاہ و جلال قائم و دائم

پردہ گر جاتا ہے

سین نمبر ۷

روپ متی اور باز بہادر شکاری کپڑے پہنے
جنگل میں ہرن کے پیچھے گھوڑے ڈالے چلے
جا رہے ہیں۔ ہرن زخمی ہو کر گھنے جنگل میں
گھس جاتا ہے۔ یہ بھی گھوڑوں سے اتر پاپیادہ
اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ چلتے چلتے اس
مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں روپ متی اور
باز بہادر کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

روپ متی۔ یہاں میرے پیر میں کانٹا لگا تھا۔

باز بہادر۔ اور میرے دل میں۔

روپ متی۔ آپ میرے زخم کے لئے مرہم
لائے تھے۔

باز بہادر۔ شکر ہے تمہیں یاد ہے۔ پر روپ
تم نے آج تک ہمارے زخم پر مرہم نہ لگایا۔

روپ متی۔ زخم کا یقین نہ تھا۔

باز بہادر۔ دل چیر کر دکھاؤں۔

روپ متی۔ ضرورت نہیں۔ پریمی دل ایک
دوسرے کے راز دار ہوتے ہیں۔

یہ باتیں ہو رہی ہیں کہ ایک سمت سے ان پر
شیر جھپٹتا ہے۔ روپ متی باز بہادر کے سامنے
آکر تیر چلاتی ہے۔ شیر زخمی ہو کر آگے بڑھتا ہے
باز بہادر روپ متی کو اپنے پیچھے لے لیتا ہے
اور تلوار کا ایک تلا ہوا ہاتھ مارتا ہے شیر کے
دو ہو جاتے ہیں۔

بازبہادر۔ روپ تم نے اپنی جان میرے لئے
خطرہ میں کیوں ڈالی۔
روپ متی۔ راجہ کی حفاظت پرجا کا فرض ہے
کیا یہی سوال میں بھی کرسکتی ہوں۔
بازبہادر۔ بیشک پرجا کی حفاظت راجہ کا فرض ہے۔
روپ متی۔ کیا حضور نے پرجا سمجھ کر میرے لئے
اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تھی۔
بازبہادر۔ کیا تم نے راجہ سمجھ کر میری
حفاظت کی تھی۔
روپ متی۔ اچھا تو پھر آپ میرے لئے سینہ سپر
کیوں ہوئے بتائیے۔
بازبہادر۔ راج ہٹ اجازت نہیں دیتی
تم بتاؤ روپ۔
روپ متی۔ تریاہٹ اجازت نہیں دیتی۔
تھوڑی دیر دونوں خموش رہتے ہیں۔
بازبہادر۔ اچھا روپ ہم ایک ترکیب بتائیں۔
روپ۔ فرمائیے۔
بازبہادر۔ ہم دونوں اپنے دل کی بات شیر
کے خون سے اس پتھر پر لکھ دیں۔ یہ ہماری محبت
کا سب سے پہلا راز دار ہے۔
دونوں پتھر پر لکھتے ہیں۔ روپ لکھتی ہے
کہ من کا راجہ باز بہادر لکھتا ہے۔ من کی
رانی پھر ایک دوسرے کا لکھا پڑھتے ہیں۔
بازبہادر۔ من کا راجہ۔
روپ متی۔ من کی رانی۔

گانا

من کا راجہ۔ من کی رانی۔ نیا زمانہ بھری جوانی
من پیچھے دیوانی۔ من مندر کی رانی تو ہے۔ من
مندر کی رانی۔ من کا راجہ۔ من کی رانی۔
اک داستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اف تری کافر جوانی جوش پہ آئی ہوئی
من پیچھے دیوانی.....

سین نمبر ۸

رات کا وقت ہے۔ باغ کا منظر۔ فوجی باجے
کی آواز آرہی ہے۔ بازبہادر اور روپ متی
کرسیوں پر متمکن ہیں۔ سامنے سے عجیب
شان کی فوج گذر رہی ہے۔
پری نژاد حسین تنگ و چست پوشاکیں پہنے
سبک سیر گھوڑوں پر سوار۔ ایڑ لگاتے چلے
جارہے ہیں جب ان گھوڑوں کی ٹاپیں
زمین پر پڑتی ہیں تو رنگارنگ شرارے
نکلتے ہیں۔ پھلجھڑیاں سی چھٹتی ہیں۔

منظر متوازی

اکبری سپاہ راتوں رات کوچ کر رہی ہے۔
تند خو نوجوان تیز و تند گھوڑے اُڑائے
چلے جا رہے ہیں۔

منظر متوازی

روپ متی اور باز بہادر کے سامنے سے پھولوں کے گجرے لپٹی توپیں گذر رہی ہیں۔ ان پر حسینانِ زہد شکن متمکن ہیں۔ باز بہادر کے سامنے ایک توپ داغی جاتی ہے، چابک دست آتش باز نے کچھ ایسا انوکھا گولہ تیار کیا ہے کہ جب فضا میں پھٹتا ہے تو مختلف رنگ کے پھول ان جوانانِ چمن حسن پر نچھاور ہوتے ہیں۔

منظر متوازی

اکبری سپاہ اپنے تیر و سناں درست کر رہی ہے
یہاں سپاہ بے پناہ بھی ناوک گل فشاں
چلّے میں دھرے گھٹنوں کے بل ٹکی ہے۔

باز بہادر۔ یہ تیر و سناں کس کے لئے ہیں۔
روپ متی۔ گل خوردہ سینوں کے لئے۔
باز بہادر۔ سینہ کو چمن بنائیں گے ہم
گل کھائیں گے، گل کھلائیں گے ہم

صبح ہو رہی ہے۔ فوج ظفر موج کوچ کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ادھر بھی منزل گہ عیش کا کاروانِ حُسن رواں ہو رہا ہے۔ اب صرف باز بہادر اور روپ متی باغ میں رہ گئے ہیں۔ مالوہ کی سر زمین میں گل لالہ اپنی سُرخ شراب میں افیون گھول رہا ہے، روپ متی کی سیاہ آنکھیں اور سُرخ رخسار باز بہادر کو سیاہ مست بنا رہے ہیں۔ یہ چمن حُسن کے سرو و قمری مصروفِ سیر باغ ہیں۔

روپ متی۔ یہ باغ میرا ہے۔
باز بہادر۔ اونہوں۔ نہیں۔
روپ متی۔ یہ باغ میرا نہیں۔
باز بہادر۔ ہرگز نہیں۔
روپ متی۔ میں بھولی یہ باغ حضور کا ہے۔
باز بہادر۔ یہ بھی غلط۔
روپ متی۔ پھر یہ باغ کس کا ہے۔
باز بہادر۔ تم بتاؤ۔
روپ متی۔ سرزمین مالوہ میں کوئی زمین کا ٹکڑا ایسا نہیں جو حضور کا نہ ہو۔
باز بہادر۔ یہ زمین میری ہے۔ پر یہ باغ میرا نہیں۔
روپ متی۔ حضور آج مُعمّوں میں باتیں کر رہے ہیں۔

باز بہادر۔ روپ متی یہ باغ ملکۂ بہار کا ہے۔ جب ملکہ بہار آتی ہے باغ کھل جاتا ہے۔ پھول نچھاور کرتا ہے شبنم کے موتی برساتا ہے۔ سبزہ اس ملکہ کے قدموں میں بچھا جاتا ہے۔ جب اس کی حقیقی ملکہ آتی ہے تو باغ پھولا نہیں سماتا۔ یہ باغ اسی کا ہے۔ نہ میرا ہے نہ تمہارا .... کبیدہ خاطر نہ ہو روپ تمہارا بھی ایک باغ ہے۔

روپ متی۔ کونسا۔

باز بہادر۔ تم نہیں جانتیں۔

روپ متی۔ جانتی ہوں پر آپ کے منہ سے سُننا چاہتی ہوں۔

باز بہادر۔ میرے منہ سے۔ اچھا تو سنو۔ میری روپ متی کا باغ۔ میری من مندر کی دیوی کا باغ میرا دل ہے جو اس کے آنے سے کھل جاتا ہے اور جانے سے مُرجھا کر رہ جاتا ہے۔ میرے دل کی ملکہ تم ہو، اس باغ کی بہار تم ہو روپ۔

روپ متی۔ میرا باغ سدا بہار رہے گا۔

باز بہادر۔ کون جانے روپ۔

روپ متی۔ میں جانتی ہوں۔

باز بہادر۔ ؏

کس را وقوف نیست کہ انجامِ کار چیست

اجل لگائے ہوئے گھات ہر کسی پہ ہے
بہوش باش کہ عالم رواروی پہ ہے

روپ متی۔ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

باز بہادر۔ آج دل پریشان سا ہے کچھ وسواس چلے آ رہے ہیں۔ بہار کے بعد خزاں کا اندیشہ ہے وصل کے پس منظر میں فراق نظر آ رہا ہے۔

روپ متی۔ یہ باتیں جانے دیجئے۔

باز بہادر۔ اچھا تو میرے سازِ دل سے چھیڑ چھاڑ کرنے والے موسیقار کچھ سنا دے۔

پریم کی بستی بستی ہے یہ بستے بستے بستی ہے
بعشقم مبتلا کردی چہ کردی دلم درد آشنا کردی چہ کردی
پریم کی بستی بستی ہے یہ بستے بستے بستی ہے
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
پریم کی بستی بستی ہے یہ بستے بستے بستی ہے
اس بزم جہاں میں ہر جانب پریم کا ساغر چلتا ہے
ساغر پہ صراحی جھکتی ہے گل بلبل سے جا ملتا ہے
پریم کی بستی بستی ہے

باز بہادر۔ روپ یہ پریم کی بستی خواب ہے یا حقیقت۔

روپ متی۔ حقیقت۔

باز بہادر۔ یہ پریم نگر سرا ہے یا گھر۔

روپ متی۔ گھر۔ پر کسی کی جاگیر نہیں۔

باز بہادر۔ پروانہ جل جاتا ہے۔ شمع رونق محفل بنی رہتی ہے۔
روپ متی۔ پروانہ جل جاتا ہے۔ شمع جلتی رہتی ہے۔ پریمی دل جُدا نہیں ہوتے۔
باز بہادر۔ سچ۔
روپ متی۔ ہاں سچ۔ ایک دل اگر بند ہو جاتا ہے تو دوسرا ختم ہو جاتا ہے۔
باز بہادر۔ یہ بات ہے تو لاؤ ہاتھ مارو۔

ادھر تو یہ ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہیں۔ ادھر توپ کی آواز آتی ہے۔ دونوں بھونچکا سے ہو جاتے ہیں۔ ملازم گھبرایا ہوا آتا ہے۔

ملازم۔ عالی جاہ شہنشاہ اکبر کا کوکہ ادہم خاں فوج لے کر چڑھ آیا ہے۔ کیا حکم ہے۔
باز بہادر۔ مقابلہ کیا جائے۔ (ملازم چلا جاتا ہے باز بہادر روپ متی کی طرف مخاطب ہو کر)

دل میں برسوں سے تھی خاش جسکی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

روپ میری دنیا کی ہر چیز تجھ پر سے نثار اور تو میری عزّت پر سے نثار۔ اس عزّت کا خیال رہے اچھا خدا حافظ۔

باز بہادر چلا جاتا ہے۔ رُوپ متی اُسے دُور تک دیکھتی رہتی ہے۔ جب آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو پتھر کی بنچ پر مُرجھائی ہوئی کلی کی طرح ٹکتے ہوئے کہتی ہے۔

روپ۔ ساتھ اس کے مری نگاہ گئی
جب نگاہ تھک گئی تو آہ گئی

روپ متی کے پیچھے ایک عورت سجنی نامی آن کھڑی ہوتی ہے۔ روپ متی ایک شاخ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ جس پر فاختہ کا جوڑا بیٹھا ہے۔ باز جھپٹا مارتا ہے ایک کو پنجہ میں لیجاتا ہے۔ دوسری فاختہ اُڑجاتی ہے۔

سجنی۔ پریم کا بندھن ٹوٹ گیا۔

جو فاختہ باز کے چُنگل سے بچ گئی تھی چکر کھا کر پھر وہیں آن بیٹھتی ہے۔

روپ۔ یہ بندھن سانس کے ساتھ ٹوٹتا ہے یہ سنگت جان کے ساتھ چھٹتی ہے۔

سین نمبر ۹

رن گھمسان کی ہو رہی ہے۔ باز بہادر ایک ٹیلہ پہ کھڑا دیکھ رہا ہے سپہ سالار پاس کھڑا ہے۔

سپہ سالار۔ فوج پسپا ہو رہی ہے۔
باز بہادر۔ میں دیکھ رہا ہوں۔
سپہ سالار۔ اب کیا حکم ہے۔

باز بہادر۔ چند آخری احکام۔ حرم سرا پر سپاہی مقرر کر دئے جائیں۔ بحالت شکست ختم کر دیں سمجھ گئے۔

سپہ سالار۔ جو حکم

باز بہادر۔ میرا گھوڑا۔ اب میں تیار ہوں۔

(باز بہادر اور بوڈی گارڈ کا رسالہ (بدرقہ) تلواریں سونت کر دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ باز بہادر میدان چھوڑ کر بھاگتا ہے۔ فوج میں بھگدڑ پڑ جاتی ہے۔)

سین نمبر ۱۰

(ادہم خاں۔ بشانِ خسروی ایک خیمہ میں بیٹھا ہے ملازم دست بستہ کھڑے ہیں۔)

ادھم خاں۔ ہم فاتح ہیں۔ باز بہادر آشیانہ چھوڑ گیا۔ اس کی حرم کی بہت تعریف سنی ہے۔ حاضر کی جائیں۔

ملازم۔ شکست کی خبر سنتے ہی مقررہ سپاہیوں نے حسینانِ حرم کو تہ تیغ کر دیا۔

ادھم خاں۔ اور روپ متی۔

ملازم۔ حضور کے اقبال سے بچ گئی۔ لیکن زخمی ہے۔

ادھم خاں۔ حاضر کی جائے۔

(ملازم جاتا ہے)

ادھم خاں۔ اس عورت کے حسن کا شہرہ دور دور ہے۔ زخمی ہے۔ زخم مندمل ہو جائیں گے۔

(زخمی روپ متی ایک پُر تکلف مسہری پر لائی جاتی ہے تکیوں کے سہارے بیٹھی ہے)

ادھم۔ تخلیہ۔

(ملازم چلے جاتے ہیں، ادھم خاں روپ متی کو بغور دیکھ کر۔)

ادھم۔ یہ ہے ہمارے مالِ غنیمت کا لعل شب چراغ تم ہو روپ متی۔ تم ہو باز بہادر کا خزانہ حسن، سرمایۂ عیش۔ روپ متی تم روپ کی دیوی ہو۔ دلوں کی ملکہ۔ بولتی کیوں نہیں۔ کیا سوچ رہی ہو۔

روپ متی۔ عالی جاہ! میں یہ سوچ رہی ہوں کہ باز کا شکاری ایک بھنگے پہ تاک لگا رہا ہے۔ کاسۂ سر سے کھیلنے والا جام سفال کے در پے ہے۔

ادھم خاں۔ کہے جاؤ۔ روپ تمہاری آواز میں رس ہے۔

روپ متی۔ بروگ رس ہے سرکار۔ ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے۔ حضور یہ ساز ٹوٹ چکا ختم ہو چکا خاک میں مل چکا۔

ادھم خاں۔ یہ حسن جہاں افروز خاک میں ملنے والا نہیں۔

روپ متی۔ سرتاجدار خاک میں مل گیا۔ یہ حُسن کے دن کا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ادھم خاں۔ روپ متی تم روپ کی ملکہ ہو میں تمہیں دنیا کی ملکہ بناؤں گا۔

روپ متی۔ آپ کی مہربانی۔

ادھم خاں۔ دنیا کے سر تمہارے سامنے جھکواؤنگا۔

روپ متی۔ حضور کا کرم

ادھم خاں۔ تمہیں تختِ شاہی پر بٹھاؤں گا۔

روپ متی۔ آپ کی عنایت۔

ادھم خاں۔ کیا تم اس سے خوش نہیں۔

روپ متی۔ نہیں۔

ادھم خاں۔ کیوں۔

روپ متی۔ حضور میں ملکہ بھی بن چکی۔ دنیا کے سر بھی میرے سامنے جھک چکے ہیں تختِ شاہی پر بھی بیٹھ چکی، اب کوئی تمنا باقی نہیں۔

ادھم خاں۔ تمہارے باغِ حُسن پر ابھی بہار ہے۔

روپ متی۔ اس کا مالی نہ رہا۔

ادھم خاں۔ تم حُسن کی دیوی ہو۔

روپ متی۔ اس کا پجاری نہ رہا۔

ادھم خاں۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو روپ سمجھ میں نہیں آتیں۔

روپ متی۔ حضور مرد ہیں۔

ادھم خاں۔ مطلب۔

روپ متی۔ اگر عورت ہوتے تو ان جذبات کو سمجھ سکتے۔ عالی جاہ باغ میں جب بہار آتی ہے تو باغ پھولا نہیں سماتا۔ عورت کے باغِ حُسن پر ایکبار بہار آتی ہے اور وہ مالی کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے یہ کنول ایک دفعہ کھلتا ہے۔ یہ پودہ ہر مالی کا ہاتھ برداشت نہیں کرتا۔

ادھم خاں۔ کملا جاتا ہے۔

روپ متی۔ نہیں۔

ادھم خاں۔ پھر۔

روپ متی۔ مرجاتا ہے۔ ختم ہو جاتا ہے، خاک میں مل جاتا ہے۔

ادھم خاں۔ ہوں۔ اچھا اس وقت تم جاؤ، ہم تم کو پھر بلائیں گے۔ زخم مندمل ہو جانے پر۔

روپ متی۔ دل کے زخم مندمل نہیں ہوتے۔

ادھم خاں۔ زمانہ بہت بڑا معالج ہے۔

(روپ متی چلی جاتی ہے)

سین نمبر ۱۱

ادھم خاں بیٹھا جواہرات دیکھ رہا ہے۔ جوہری قریب کھڑا ہے۔

ادھم خاں۔ یہ ہیں باز بہادر کے جواہرات، اچھا انتخاب ہے۔ ہیرا تو خوب ہے۔ پر کچھ چپٹا ہوا سا ہے اور بیچ میں ایک لال دھبا بھی ہے۔

جوہری۔ حضور یہ ہیرا میرے ہاتھوں خریدا گیا تھا۔ یہ بالکل بے عیب تھا۔

ادھم خاں۔ تو پھر اس کو رکھے رکھے کیا ہو گیا۔

جوہری۔ حالی جاہ جس روز باز بہادر کو شکست ہوئی یہ ہیرا تڑخ گیا۔ اور اس میں یہ لال زخم سا پڑ گیا۔

ادھم خاں۔ (ہیرے کو غور سے دیکھتے ہوئے) یہ ہیرا زخمی ہے۔ باز بہادر اور بھی ایک زخمی ہیرا ہمارے واسطے چھوڑ گیا ہے۔

سین نمبر ۱۲

(روپ متی پلنگ پر لیٹی ہے۔ سجنی ذرا فاصلے پر بیٹھی ہے)

سجنی۔ آپ کے زخم بھر گئے۔

روپ متی۔ ہاں۔

سجنی۔ مبارک ہو۔

روپ متی۔ کاش نہ بھرتے۔

سجنی۔ کیوں۔

روپ متی۔ دل کا زخم ہرا ہے۔

سجنی۔ وہ نہیں بھرا۔

روپ متی۔ ناسور بھرا نہیں کرتے۔

روپ متی دیوار کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہاں ایک چیونٹا دوسرے مردہ چیونٹے کو لادے لئے چلا جا رہا ہے۔ سجنی کی نگاہ بھی اُدھر پڑتی ہے۔

سجنی۔ کیا دیکھ رہی ہو۔

روپ متی۔ پریم پجاری اپنا مندر لئے چلا جا رہا ہے۔ چیونٹا ٹھیر جاتا ہے۔

سجنی۔ پجاری جی تھک گئے۔

چیونٹا پھر چلنا شروع کر دیتا ہے

روپ متی۔ شمع اپنی لَو سے تھکتی نہیں۔ پریمی پریم سے اُکتاتے نہیں۔ (کھڑکی میں سے شاخ نظر آ رہی ہے۔ فاختہ وہیں بیٹھی ہے، روپ متی اس کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے) دیکھو ابھی تک دھن کی پکی دھونی رمائے بیٹھی ہے۔

سجنی۔ آج حضور تشریف لائیں گے۔

روپ متی۔ معلوم ہے۔

سجنی۔ تم نے اب تک سنگار کیوں نہیں کیا۔

روپ متی۔ سنگار۔ کس کے لئے۔

سجنی۔ تم کو آج حضور سے ملنا ہے۔

روپ متی۔ ہاں ملنا ہے۔ مجھے آج حضور سے ملنا ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ مارا تھا، پروانہ جل چکا۔ شمع نے بھی اپنے دن پورے کر دیئے۔ پر یہی دل جدا نہیں ہوتے۔ ایک دل بند ہو گیا۔ دوسرا ابھی ختم ہو جائے گا، آج جانا ہے جانا ہے۔

روپ متی سنگار کرتی جاتی ہے اور دیوانہ وار گاتی جاتی ہے۔

جانا ہے جانا ہے۔ ہمیں پیا ملن کو جانا ہے۔ پیا ملن کو جانا ہے۔

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے
جانا ہے جانا ہے

روپ متی گانا ختم کرتی ہے۔ دوسرے صحرا والے فقیر کے گانے کی آواز آتی ہے۔

گانا۔ مقدر کی خبر کس کو۔

کبھی ہے تخت شاہی اور کبھی ہے زہر کا پیالہ
یہ دنیا ہے نہیں اک حال پہ ہرگز قرار اسکو
مقدر کی خبر کس کو

روپ متی یہ سنکر اٹھتی ہے۔ صراحی میں سے گلاس میں پانی الٹتی ہے۔ انگلی میں سے انگشتری اتار کر اسے کھولتی ہے اور کچھ سفوف سا پانی میں گھول دیتی ہے۔ باہر سے آوازیں آتی ہیں۔

آوازیں۔ حضور تشریف لاتے ہیں۔ حضور تشریف لاتے ہیں۔

روپ متی کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے۔ باز آتا ہے اور فاختہ کو پکڑ کر لیجاتا ہے
روپ گلاس پی جاتی ہے۔ آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

آوازیں۔ حضور تشریف لاتے ہیں حضور تشریف لاتے ہیں۔

روپ متی۔ آتی ہوں، باز بہادر میں آتی ہوں پر یہی دل جدا نہیں ہوتے۔ پروانہ جل چکا۔ شمع بھی جل چکی۔

ادھم خاں داخل ہوتا ہے، روپ متی کو
مُردہ پاتا ہے۔ دور سے گانے کی آواز آتی ہے۔

گانا۔ مقدر کی خبر کس کو۔

سین نمبر ۱۳

اکبر ہاتھی لڑوا رہا ہے۔ مخبروں کا افسر اعلیٰ
آکر مجرا عرض کرتا ہے۔ اکبر اس کی طرف
مخاطب ہوتا ہے۔

افسر۔ منہیانِ بارگاہ عالی خبر پرداز ہیں کہ ادھم خاں کو کہ کے دستِ ہوس سے بچنے کے لئے باز بہادر حاکم مالوہ کی معشوقۂ خاص روپ متی نے زہر کھالیا۔

اکبر کے چہرے پر غصہ کے آثار نمودار ہوتے ہیں

اکبر۔ (افسر سے) ادھم خاں کو روپ متی کے قتل کی سزا دینے ہم مالوہ جا رہے ہیں۔

افسر۔ (دست بستہ) تنہا

اکبر۔ بادشاہ کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ خدا کا سایہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ لشکر کو حکم دو کہ جہاں پل سکے پل جائے۔

اکبر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ ملازم خاصہ کا
گھوڑا لئے کھڑا ہے۔ سوار ہو جاتا ہے اور
گھوڑا دوڑا دیتا ہے۔

سین نمبر ۱۴

ماہم انا گا۔ ادھم خاں کی ماں بیٹھی ایک
عورت کے ساتھ شطرنج کھیل رہی ہے۔

عورت۔ یہ بازی تو ماہم انا گا ہار گئیں۔

انا گا۔ ماہم انا گا صرف شہنشاہ اکبر سے بازی ہارتی ہے۔

عورت۔ عالیجاہ تو آج آگرہ سے سدھار گئے۔

انا گا۔ کہاں۔

عورت۔ مالوہ۔

انا گا۔ کیوں۔

عورت۔ کچھ اطلاعات موصول ہوئی تھیں۔

انا گا۔ (تالی بجاتی ہے۔ ملازمہ آتی ہے) مرزا عبد اللہ کو بلاؤ۔

ملازمہ۔ مرزا عبد اللہ باہر منتظر ہیں۔

انا گا۔ (عورت سے) یہ بازی اسی طرح مقفل کر دو۔ ہم پھر کھیلیں گے۔

بساط مہروں سمیت اٹھالی جاتی ہے۔ انا گا
اٹھ کر چلی جاتی ہے۔

سین نمبر ۱۵

ایک کمرہ میں ماہم انا گا داخل ہوتی ہے۔
مرزا عبد اللہ سلام کرتے ہیں۔

مرزا۔ شہنشاہ اکبر مالوہ سدھارے۔
اناگا۔ ہمیں معلوم ہے اطلاعات کیا ہیں۔
مرزا۔ باز بہادر کی معشوقہ روپ متی کے قتل کا
الزام آپ کے صاحبزادہ پر۔
اناگا۔ شہنشاہ کو روانہ ہوئے کتنی دیر ہوئی۔
مرزا۔ تقریباً دو گھنٹہ۔
اناگا۔ دیر ہو گئی۔ تم نے پہلے اطلاع
کیوں نہیں کی۔
مرزا۔ (ہاتھ باندھ کر) یہ ناچیز سامان سفر
درست کر رہا تھا۔
اناگا۔ اکبر پہلے پہنچ جائے گا۔
مرزا۔ صبا رفتار گھوڑے تیار ہیں۔
اناگا۔ لیکن اکبر جیسے سوار کہاں سے لاؤ گے۔
خیر دیر کے پہنچنا نہ پہنچنے سے بہتر ہے۔

سین نمبر ۱۶

اکبر شاہی خیمہ میں بیٹھا ہے۔ ادھم خاں
ملزم کی حیثیت سے سامنے دست بستہ کھڑا ہے۔

اکبر۔ تم پر روپ متی کے قتل کا الزام ہے۔
ادھم خاں۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا۔
اکبر۔ پھر کس نے کیا۔
ادھم خاں۔ اس نے خودکشی کی۔
اکبر۔ اس نے خودکشی کیوں کی۔

ادھم خاں خاموش کھڑا ہے۔

اکبر۔ اس کا جواب تمہارے پاس نہیں۔
(غصہ کی حالت میں) تم نے سمجھا تھا کہ اکبر کو اطلاع
نہیں ہو گی، تم نے سمجھا تھا کہ اکبر بے خبر رہے گا۔
تم اپنی دانست میں اکبر کی پہنچ سے باہر نکل گئے تھے۔
تم یہ نہ سمجھے تھے کہ انصاف آئین اکبری نہیں،
قانون قدرت ہے اور انسان حدود قدرت سے
باہر نہیں نکل سکتا۔ تم نے ایک انسان کی جان
لی ہے، اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ ملزم
کو لے جاؤ۔

ادھم خاں کو سپاہی لے جاتے ہیں، اکبر
تنہا ڈیرہ میں ٹہل رہا ہے۔ ملازم آتا ہے۔

ملازم۔ ماہیم اناگا شرف باریابی کی طالب ہیں۔
اکبر۔ آنے دو۔

اکبر کے چہرے پر ایک خاص اکسپریشن ہے
ماہیم اناگا آتی ہے۔ دست شاہی کو بوسہ
دیکر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

اکبر۔ اناگا ہم جانتے ہیں تم جس لئے آئی ہو۔
اناگا۔ میں اپنے بچہ کی جان مانگنے آئی ہوں۔
اکبر۔ کیا انسان انسان کو جان دے سکتا ہے۔

اناگا۔ ہاں۔ بادشاہ وقت دے سکتا ہے۔
اکبر۔ اگر ایسا ہوتا تو بادشاہوں کے مقبرے نظر نہ آتے۔ سر تاجدار خاک میں ملے ہوئے اس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔
اناگا۔ بادشاہ کے حکم سے جان لی جاتی ہے۔
اکبر۔ بادشاہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے اور صرف وہی ایک ذات جان دے سکتی ہے اور جان لے سکتی ہے۔
اناگا۔ میں رحم کی بھکارن آئی ہوں۔
روا مدار کہ محروم از آستاں بردیم۔
اکبر۔ خدا کے ہاں نہ بیجا رحم ہو نہ بے جا ظلم۔
اناگا۔ ماہیم اناگا شہنشاہ اکبر سے نہیں اپنے بیٹے اکبر سے سفارش کرنے آئی ہے۔
اکبر۔ شہنشاہ اکبر اور ماہیم اناگا کے بیٹے اکبر دونوں کو اس دربار میں جواب دہی کرنی ہے جہاں کسی کی سفارش کام نہ آئے گی۔
اناگا۔ آج شہنشاہ اکبر بھول گیا۔ کہ جب اکبر ایک سال کا تھا اور میدان جنگ میں تیر موسلا دھار مینھ کی طرح برس رہے تھے۔ اس وقت اس اناگا نے اکبر کو سپر بن کر بچایا تھا۔
اکبر۔ شہنشاہ اکبر بھولا نہیں کرتا۔ کیوں اناگا اس جنگ میں تیرا کون کون مارا گیا تھا۔
اناگا۔ بھائی بھتیجہ۔ چچا۔ تایا۔ کون تھا جو اس روز اس سر پر سے نثار نہیں ہوا۔
اکبر۔ اناگا۔ اگر تیرے ہاتھ میں بچانا ہوتا تو اپنے بھائی بھتیجے۔ چچا۔ تایا کو بھی مرنے نہ دیتی انسانی زندگی کو بچانا ماہیم اناگا کے ہاتھ میں نہیں۔ محافظ حقیقی کوئی اور ہی ہے۔ تجھ کو یاد ہے جب اکبر کو قلعہ کی دیوار پر بٹھا دیا گیا تھا اور اس دیوار پر گولے اس طرح گر رہے تھے جیسے پکی ہوئی کھیتی پر ٹڈیاں گرتی ہیں۔
اناگا۔ یاد ہے بھول نہیں سکتی۔ ظالم چچا نے یہ غضب ڈھایا تھا۔
اکبر۔ اس وقت اکبر کو کس نے بچایا۔
اناگا۔ خدا نے۔
اکبر۔ اکبر اسی خدا کا حکم مانتا ہے جو مارنے اور جلانے والا ہے۔
اناگا۔ میں اپنے دودھ کا واسطہ دیکر ایک آخری درخواست کرتی ہوں۔
اکبر۔ اگر خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہیں تو رد نہیں کی جائے گی۔
اناگا۔ تا انفصال مقدمہ ادھم خاں کی آزادی

سلب نہ کی جائے۔

اکبر۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ وہ اکبر سے بچکر نکل جائیگا۔

اناگا۔ شہنشاہ اکبر کی اناگا۔ اکبر کو اس وقت سے جانتی ہے جب کہ وہ خود اپنے کو نہیں جانتا تھا۔ وہ اکبر جس نے چودہ برس کی عمر میں بیرام خاں کے ہاتھ سے عنانِ سلطنت چھین لی۔ جس کی چشم غضب سے مست ہاتھی تھرا کر کترا کر نکل جاتے ہیں۔ جس نے تمام ہندوستان کے دل ایک تاگہ میں پرو دئے ہیں اس اکبر کے قابو سے نکل جانا ممکن نہیں۔ عالی جاہ اطمینان رکھیں۔ یہ سعی لاحاصل نہیں کی جائے گی۔

اکبر دستک دیتا ہے۔ ملازم حاضر ہوتا ہے۔

اکبر۔ ادھم خاں کو آزاد کر دیا جائے۔

اناگا سلام کر کے چلی جاتی ہے۔

سین نمبر ۱۷

کمرہ میں ماہیم اناگا اور ادھم خاں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک حبشی غلام کھڑا ہے،

ماہیم اناگا۔ اس واقعہ کے گواہ کون ہیں۔

ادھم خاں۔ سجنی کو سب خبر ہے۔ لیکن اس کو اپنی طرف ملایا جا سکتا ہے۔

ماہیم۔ شہنشاہ اکبر کے روبرو جھوٹ بولنا آسان کام نہیں۔

ادھم خاں۔ پھر کیا کیا جائے۔

ماہیم۔ کٹا ہوا سر راز دار ہوتا ہے۔

ادھم خاں اپنی کمر سے خنجر نکال کر حبشی غلام کو دیتے ہوئے۔

ادھم خاں۔ یہ سجنی کے واسطے ہے۔

سین نمبر ۱۸

سجنی ایک پلنگ پر سو رہی ہے حبشی غلام آہستہ آہستہ داخل ہوتا اور سینہ میں خنجر بھونک دیتا ہے۔

سین نمبر ۱۹

اکبر کو ایک ملازم شب خوابی کے کپڑے پہنا رہا ہے ایک اور ملازم داخل ہوتا ہے۔

اکبر۔ کیا کہنا ہے۔

ملازم۔ باز بہادر کے حرم کی ایک عورت سجنی نامی قتل کر دی گئی۔

اکبر۔ کس طرح۔

ملازم۔ اس خنجر سے۔

اکبر۔ (خنجر کو دیکھ کر) یہ خنجر تو ہم نے ادھم خاں کو دیا تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست طویل ہوتی جاتی ہے۔ قریب ہے کہ سزا کی مہر ثبت کر دی جائے۔ ادھم خاں کو کل صبح ہمارے روبرو پیش کیا جائے۔

سین نمبر ۲۰

ادہم خاں کمرے میں بیٹھا ہے۔ جو ملازم اکبر کو کپڑے پہنا رہا تھا سامنے کھڑا ہے۔

ادھم خاں۔ شہنشاہ اکبر نے کیا فرمایا۔

ملازم۔ حضور کے الفاظ تھے۔ اس کے جرائم کی فہرست طویل ہوتی جاتی ہے۔ قریب ہے کہ سزا کی مُہر ثبت کر دی جائے۔ ملزم کو کل صبح ہمارے روبرو پیش کیا جائے۔

ادھم خاں ملازم کو اپنی انگوٹھی بطور انعام دیتا ہے۔ وہ سلام کر کے چلا جاتا ہے۔

ادھم خاں غور و فکر کے انداز میں ٹہل رہا ہے۔

ادھم خاں۔ قریب ہے کہ سزا کی مہر ثبت کر دی جائے۔ قریب ہے کہ مُہر لگانے والا ہاتھ بے کار کر دیا جائے۔

تلوار کو قدرے نیام سے باہر نکالتا ہے پھر نیام میں داخل کر کے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اندھیری رات میں باہر نکل جاتا ہے۔

سین نمبر ۲۱

خوابگاہ کا خیمہ۔ اکبر سو رہا ہے۔ سپاہی باہر پہرہ دے رہا ہے۔ ادھم خاں آتا ہے۔ پہرہ دار کو مار دیتا ہے۔ اس آواز سے اکبر کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ نہتہ خیمہ سے باہر نکل آتا ہے۔ ادھم خاں اس پر حملہ کرتا ہے۔ وہ ہاتھ سے تلوار کا وار روک کر ایک گھونسہ مارتا ہے اور ادھم خاں بیہوش ہو کر گرتا ہے۔ گرفتار ہوتا ہے۔

سین نمبر ۲۲

دربار اکبری۔ ادھم خاں ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہے ایک طرف ماہم اناگا موجود ہے۔

مخدوم الملک۔ باز بہادر کی معشوقہ روپ متی نے ادھم خاں کی نفسانی خواہشات سے بچنے کے لئے زہر کھایا۔ تمام ثبوت پیش کئے جا چکے ہیں۔ اب حکم عالی صادر ہونا باقی ہے۔

ماہم اناگا۔ (آگے بڑھ کر) اس سے پہلے کہ شاہی حکم ملزم کی قسمت کا فیصلہ کر دے۔ ملزم کی ماں کچھ کہنے کی اجازت طلب کرتی ہے۔

اکبر۔ اجازت ہے۔

ماہم اناگا۔ کیا میں یہ دریافت کر سکتی ہوں کہ اس دربار میں فیصلہ کس قانون کے تحت کیا جاتا ہے۔

مخدوم الملک۔ شرع کے مطابق۔

ماہم اناگا۔ (ایک کتاب اٹھا کر پڑھتے ہوئے) اگر مقتول کے پس ماندگان خوں بہا لینے پر رضامند ہوں تو باہمی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔

اکبر۔ روپ متی مقتول کے اعزا کہاں ہیں۔

ماہم انا گا۔ موجود ہیں۔ اگر اجازت ہو پیش کئے جائیں۔

اکبر۔ اجازت ہے۔

رام داس اور پاربتی سامنے آتے ہیں۔

ماہم انا گا۔ یہ ہیں مقتول کے وارث۔

اکبر۔ ثبوت۔

بڈھا کاغذات پیش کرتا ہے مخدوم الملک کاغذات دیکھ کر۔

مخدوم الملک۔ مہر تو بیشک باز بہادر کی ہے۔

اکبر۔ (سر ہلا کر) ملزم کے جرائم کی فہرست روپ متی کے قتل پر ختم نہیں ہوتی۔ جاری رکھو۔

مخدوم الملک۔ (کاغذات پڑھتے ہوئے) ادھم خاں کے حکم سے سجنی نامی ایک عورت قتل کی گئی۔

ماہم انا گا۔ (چکراتی ہے۔ برابر کھڑی ہوئی لونڈی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) ثبوت

مخدوم الملک کے اشارے پر نقیب سجنی کا خون آلود کرتہ پیش کرتا ہے۔

مخدوم الملک۔ جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا

ماہم انا گا۔ کیا ثبوت کہ اس قتل میں میرے لڑکے ادھم خاں کا ہاتھ تھا۔

مخدوم الملک۔ (ادھم خاں کا خنجر پیش کرتے ہوئے) زبان خنجر بھی خاموش نہیں ہے۔ یہ خنجر ملزم کو باب عالی سے عطا ہوا تھا۔

ماہم انا گا۔ (سنبھل کر) ملزم کو صفائی کے واسطے وقت دیا جائے۔

اکبر۔ فہرست جرائم جاری رکھو۔

مخدوم الملک۔ (کاغذ پڑھتے ہوئے) ملزم شہنشاہ اکبر کی خوابگاہ میں محافظ سپاہی کو قتل کرتا ہوا۔ تیغ بدست قاتلانہ ارادہ سے داخل ہوا۔ اور ظل سبحانی پر حملہ آور۔

ماہم انا گا۔ (چکرا کر گرتے ہوئے) محسن کش۔

سارا دربار پکار اٹھتا ہے۔

سر بریدن لازم است۔

دور سے آواز آتی ہے "بغاوت کی خبر کس کو ہے"

طوائف اور ہم

میں ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھی تھی۔ کسان اپنے کام میں مصروف تھا۔ خودرو نباتات ایک طرف اکھیڑ کر ڈالتا جاتا۔ اس میں کام کے پودے بھی تھے ناکارہ بھی لیکن کھیت گیہوں کا تھا اور یہ اس جنس کے نہ تھے کھائے یہ بھی جائیں گے۔ پر انھیں صرف مویشی کھائینگے۔

بیج ان کا بھی پڑا تھا۔ ان کے لئے بھی زمین کا سینہ شق ہوا تھا۔ دھرتی ماتا کا لہو انہوں نے بھی پیا تھا۔ پر کیا کریں غلط جگہ اُگ آئے۔

بہت سی چڑیاں ایک چڑے کو مارتی ہوئی آئیں سب کہہ اٹھے۔ بے ایمان نے بدمعاشی کی ہوگی۔ انسان کا قانون حیوان سے مختلف ہے۔ یہاں چڑے چڑیاں مل کر صرف چڑیا ہی کو مارتے ہیں۔

یہ پنچھی اڑ گئے۔ ایک اور جھرمٹ آیا۔ یہ سب ایک چڑیا کو مار رہے تھے۔ وہ رنگی ہوئی تھی۔ اس کے ہمجنس اسے مارے ڈالتے تھے۔ اس کا رنگ بدلا ہوا تھا اور رنگنے والا ہاتھ کسی اور یہ رنگ چڑھا رہا تھا۔

دنیا کا انصاف نرالا ہے۔ مال مسروقہ کو سزا دی جاتی ہے سارق بلو بچ جاتا ہے۔

کسان کی گھروالی روٹی لے کر آئی۔ نیلے پیلے بدرنگ پھٹے پرانے کپڑے۔ سانولا رنگ بھدا بھدا نقشہ۔ مرد نے پانی کھینچا۔ عورت نے زمین جھاڑی۔ دونوں کنوئیں پہ کھانے ہو بیٹھے۔ موٹی موٹی روٹیاں لگاون میں پیاز اور گڑ سب گنا چنا۔ شاید پیٹ بھراؤ بھی نہیں۔ عورت گٹھی بھی چھوٹی اٹھاتی تھی اور ڈلی بھی۔ بڑی بڑی مرد کے آگے سرکاتی جاتی۔ مرد ان جذباتی حرکات سے بے خبر نوالے مار رہا تھا۔ کام کرنے پیدا ہوا ہے۔ اس نسوانی شاعری سے آشنا نہیں۔ نہ وہ فطری شاعرہ ہی داد طلب تھی۔ وہ بھی یہ سب کچھ نادانستہ طبعی طور پہ کر رہی تھی۔ ایثار اس کے خمیر میں تھا۔ عورت تھی۔

عورت میں بھی ہوں۔ طینت وہی ہے۔ شاید خمیر غلط اٹھایا گیا ہے۔

جو۔ رزق ہے۔ ایک شکل میں حیات بخش دوسری شکل میں خرمن خرد سوز کج رو کبھڑی احول ہوں زدہ عقل انسانی نے جو سے بیر (Beer) بنائی۔ انگور سے شیمپین (Chahaigne) عورت سے رنڈی۔

میں اس غوطہ میں بیٹھی تھی کہ ایک صاحب نے میری جانب اشارہ کرکے فرمایا۔ یہ بیچاریاں ازدواجی زندگی سے محروم ہیں۔ ایک تیر سا لگا۔ پر میں کچھ نہ بولی۔ وہ خموش ہونے والے تھے نہیں۔ کہنے لگے خدا بخشے اکبر الہ آبادی خوب کہہ گیا ہے۔ ایک نے پوچھا کیا۔ بولے قصہ طلب شعر ہے۔ وہ ہوا یہ کہ بی گوہر کلکتہ والی پشاور جا رہی تھیں، جب الہ آباد کے اسٹیشن پر پہنچیں تو اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ سامان اتروالو اور خود پلیٹ فارم پر آ کھڑی ہوئیں۔ وہ غریب پریشان کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ لیکن تڑ یا ہٹ اور پھر تڑ یا بھی.............. بہرکیف حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ وہ اس خیرہ سر کی خودسری سے واقف تھا۔ تعمیلِ حکم کی۔ یہ بیگم ٹمٹم میں سوار ہو، اکبر الہ آبادی کے گھر جا دھمکیں، سیکرٹری نے اطلاع کی کہ گوہر کلکتہ والی ملنے آئی ہیں۔ بڑے میاں اپنے بڑھاپے پر نادم۔ بیٹھک میں تشریف لائے یہ تڑاخ پڑاخ مقراض زبان بولی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آج عمر بھر کی آرزو بر آئی۔ میں تو پشاور جا رہی تھی۔ پر الہ آباد کا نام سنتے ہی دل نہ مانا کہ شرفِ قدمبوسی حاصل کئے بغیر چلی جاؤں۔ آپ جانیں عورت دل کی لونڈی ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے آج جناب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہ دن میری زندگی میں یادگار رہے گا۔

بڑے میاں نے بھی مناسب جواب دئے چلتے ہوئے کہنے لگی ایک اور آرزو ہے۔ اگر خاطر عاطر پہ گراں نہ گذرے۔ پہلے تو حضرت گھبرائے پھر ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔ اس نے کہا اگر اپنی قلم سے کچھ رقم فرمادیں تو حرزِ جان بنا کر رکھوں جناب نے یہ شعر لکھ لفافہ میں بند کر حوالہ کر دیا۔؎

کون خوش بخت زمانہ میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

کان یہ سن رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے ازدواجی زندگی اپنے مناظر پیش کر رہی تھی اور میں اس تماشے میں غرق تھی۔ ایک عجیب لطف تھا۔ عجیب کھٹک۔ نرالی کاوش تھی۔ اچھوتی خراش۔ سینہ میں میٹھا میٹھا درد ہوتا تھا۔ میں ان کیفیات میں ایسی محو تھی جیسا بھوکا روٹی کے تصور میں۔ بانجھ اولاد کے خیال میں۔ اولاد ماں کے دھیان میں۔

سینہ میں ایک چیز تھی۔ جو کچھ مانگ رہی تھی۔ پہلو میں ایک خلا تھا جو آج میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ میرا رُواں رُواں کسی چیز کا متلاشی تھا۔ میرا ہر قطرۂ خون کسی کی تلاش میں رواں۔ میری نسائی

فطرت میں ایک طوفان بپا تھا۔

آج مجھ میں وہ عورت جاگ اٹھی تھی جو بیوی بننے پیدا ہوئی ہے، جو ماں بننے پیدا ہوئی ہے جو اپنے کو قربان کرنے پیدا ہوئی ہے۔

آج وہ خلقت انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جسے افیون دے کر سلا دیا گیا تھا۔ آج وہ حقیقت اپنا حق مانگنے آن پہنچی تھی جس کو کذب دیا اور غلط فضا کے انبار میں دبا دیا گیا تھا۔

فطرت ماحول کے خول کو توڑ رہی تھی۔ زندگی کا جامہ چاک کر کے عورت بر آمد ہونے کو تھی، عورت جو کھونے کو پانا سمجھتی ہے۔ عورت جو اپنا خون چسا کر نسل انسانی کو پالتی ہے۔ عورت جو شفقت سے خمیر کی گئی ہے۔ عورت جو ماں سے تعبیر کی گئی ہے۔

میں آدم و حوا کے نمائندوں کو دیکھ رہی تھی میری روح قالب چھوڑ کر ان کے طواف میں مصروف تھی میرا دل سینہ میں سے نکل کر ان کے پیروں پر لوٹ رہا تھا۔

آج میں فطرت ہی فطرت تھی۔ ماحول سے مبرا فضا سے بالاتر جسد خاکی سے آزاد۔

مرد آدھی روٹی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ عورت تو اتنی دیر سے چھوٹے چھوٹے نوالے اسی لئے کھا رہی تھی کہ اس کا کماؤ اس کا سرتاج اس کا سردار، اس کے بچوں کا باپ۔ اس کا مرد زیادہ کھا لے وہ زنانہ شاعری تھی یہ مردانہ نثر۔

ایک صاحب مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے بھئی زہرہ تعجب ہے عورت جیسی حیا پرور، اور عصمت فروشی پر مائل ہو جائے۔

سینہ میں ایک انی سی لگی میں نے زخمی شیرنی کی طرح ان کی طرف دیکھا۔ لیکن اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

کاظم بپھرے ہوئے شیر کی مانند غرایا اور بولا ہم کو کچھ کہنے کا منہ نہیں۔ ایمان داری سے دیکھو تو تماشبین مرد اور طوائف میں تفاوت نہیں ہم کو اپنا زمانہ یاد ہے جب ہم ہزار بارہ سو ڈنڈ پیلتے تیس سیر کے پھاوڑے سے اکھاڑے کو ودتیں پلٹیاں دیتے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ زور کرتے۔ دس پانچ سے سانس بھراتے پانچ سات کو ردم بھراتے اور آخر کو اکھاڑے ہی میں دوڑ لگا کر پڑ جاتے۔ رانیں ستون بنی تھیں۔ پنڈلیاں کسی ہوئی۔ بدن پیارا چہرہ سیب سا۔ شانوں پر خربوزہ کی قاشیں رکھی معلوم ہوتی تھیں سینہ سل کی مانند جب شام کو انگرکھا پہن کر نکلتے تو دس بیس ہزار میں ایک نظر آتے۔

ہم پر نظریں پڑتی تھیں۔ جب مُحرّم اور رام لیلا کے موقع پر بھیڑ میں سے گزرتے تو لوگ خود راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں ہم اکثر مرکزِ نگاہ رہے۔ چھوٹی بڑی سترھویں پر لوگ ہمیں دیکھتے تھے۔

سوئمنگ باتھس (Swiming baths) میں ہم نہانے نہیں بدن دکھانے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر کنارہ پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ بغل بچّوں کی تیاری دیکھنے کے قابل تھی۔ سینہ اور کمر میں آٹھ انچ کا فرق۔

دن بھر سوتے شام کو بناؤ سنگار کر کے سیر کو نکل جاتے۔ تمام شب عالمِ رنگ و بو میں گزارتے۔ ہم میں اور رنڈی میں فرق نہ تھا۔ وہ بھی شب بیدار تھی ہم بھی۔ اس کا بھی صبح کا وقت ریاض کا تھا ہمارا بھی۔ شام کو وہ سولہ سنگار بارہ ابرن کئے سرِ بام نظر آتی۔ ہم سرِ بازار، وہ بھی اپنے جسم کی سوداگر تھی ہم بھی۔ نقدِ حُسن کی دکان اس نے بھی سجا رکھی تھی ہم نے بھی۔

فرق اتنا تھا کہ وہ اپنی جگہ بھاری تھی اور ہم اپنا خوانچہ در بدر لئے پھرتے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ معصیت اس کے پاس آتی تھی اور ہم معصیت کے پاس جاتے تھے۔ تفاوت اتنا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر پیٹ کی خاطر گناہ کرتی تھی اور ہم لذّتِ نفس کے لئے وہ اس ماحول میں پیدا ہوئی تھی اور ہم شریفوں کی اولاد تھے۔ اس کا ظاہر باطن ایک تھا اور ہم گندم نما جو فروش ــ وہ اپنے امراض لئے (Iso latim Hospital) میں پڑی تھی۔ اور ہم ان پر اپنی شرافت کا پردہ ڈالے سوسائٹی کی فضا مسموم کر رہے تھے۔ وہ ایسا زہر تھی جسے سب زہر جانتے تھے۔ زہر ہم بھی تھے ولے شوگر کوٹڈ۔ وہ ذلیل تھی اور ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ ذلیل ہم بھی تھے۔ لیکن شرافت میں ملبوس۔

اس سے شریف گریز کرتے تھے ہم شریفوں میں رہتے بستے تھے۔ وہ بھیڑیا تھی بھیڑیئے کے برن میں۔ بھیڑیئے ہم بھی تھے مگر بھیڑ کی کھال پہنے ہوئے۔ وہاں جال تھا جعل سازی نہ تھی یہاں دام تزویر تھا۔ وہ کوک شاستر تھی۔ اور اس پر کوک شاستر لکھا تھا۔ کوک شاستر ہم بھی تھے لیکن ہم پر صرف شاستر کی چھاپ لگی تھی۔

ہم زہر تھے شہد میں ملے ہوئے۔ ہم کانٹا تھے پھولوں میں چھپے ہوئے۔ ہم سانپ تھے سماج

کی آستینوں میں۔ زہر کی شیشی وہ بھی تھی لیکن اس
پر سُرخ لیبل لگا تھا۔ کانٹا وہ بھی تھی دلے پردۂ
ریحاں میں نہیں۔ سانپ وہ بھی تھی مگر بار آستین نہیں۔
میری آنکھیں بار احسان سے جھکی جاتی تھیں
دل کاظم کی طرف کھنچا جاتا تھا اور وہ ایک مقررانہ
انداز میں آزمودہ کار وکیل کی طرح یکے بعد دیگرے
دلائل دیتا جا رہا تھا محفل دم بخود تھی۔ کاظم کے منہ
سے پھول جھڑ رہے تھے میرے دل و جان اس پہ
نثار ہو رہے تھے۔ ہر مثال بے مثال تھی۔ ہر دلیل
ساطع۔ ہر برہان قاطع۔ ہر فقرہ ختم بیان معلوم
ہوتا۔ دلے دوسرا اس سے اونچا جاتا۔ منطق
دست بستہ کھڑی تھی۔ زبان زنبیل لئے حاضر
حُسن بیان جلو میں۔ لعنت حاشیہ بردار۔
اہلِ بزم اس کا منہ تک رہے تھے۔ میں نیچی
نظریں کئے آئینۂ دل میں دیکھ رہی تھی۔ گرانباریٔ
احسان سے نظریں نہ اُٹھتی تھیں۔
جن صاحب نے مجھ پہ طنز کیا تھا وہ بولے
خیر سے وکالت ہو رہی ہے۔ کاظم نے کہا، نہیں
حقیقت بیان کی جا رہی ہے۔ اگر عالمِ رنگ و بو
کے دلدادہ مرد اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر
دیکھیں حقیقت کو نظر انداز نہ کریں۔ سچ سے
نہ کترائیں تعصب سے کام نہ لیں تو وہ اپنے کو رنڈیوں
سے بدتر پائیں گے۔
وہ سانپ ہیں آستینوں کے کاٹنے پر معترض
وہ بھیڑیئے ہیں بھیڑوں کو راہ راست بتانے پہ
آمادہ۔ وہ لومڑیاں ہیں بلّی کی چالاکی پہ سر بہ جبیں۔
اگر ایمان داری سے دیکھئے اور ان غریبوں
کی زندگی پہ نظر غائر ڈالیئے تو نظر آجائے گا کہ
ان میں سے ننانوے فی صدی ہماری نظرِ کرم کی
مرہونِ منت ہیں۔ قابلِ تعزیر ہم ہیں وہ نہیں۔
ملامت ہم کو کرنی چاہیئے ان کو نہیں۔ لعنت ہم
پر اترنی چاہیئے ان پہ نہیں۔
وہ تو ہماری ہوس کا شکار ہیں۔ ہماری طبع
کج رفتار کی نخچیر۔ ہماری خواہشات کی آلۂ کار۔
یہ زخم ہمارے لگائے ہوئے ہیں جن کو آج
ہم وجہ عفونت کہہ رہے ہیں۔ یہ بیماری ہماری
پھیلائی ہوئی ہے جس سے آج ہم الحذر مانگ
رہے ہیں۔ یہ بِس ہمارا بویا ہوا ہے جس کا پھل
ان کو مل رہا ہے۔
جس آگ میں ان کے گھر پھک گئے وہ ہم
نے ہاتھ تاپنے کو جلائی تھی۔ جس سیلاب میں انکا
سفینۂ حیات بہہ گیا اس کے بند ہم نے ترنم آبشار

سننے کو کھولے تھے۔

گناہگار ہم ہیں، خطا کار ہم۔ الزام انکو دے رہے ہیں مطعون انھیں کر رہے ہیں۔

اُلٹے وہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
ناطاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

اب دستر خوان بچھا۔ ٹفن باسکٹ کھلا۔ انواع و اقسام کے کھانے چُنے گئے۔ دستر خوان خوان فرعون معلوم ہوتا تھا۔ میں کوشش کر کے کاظم کے پاس بیٹھی۔ طشتریاں کم تھیں۔ میں نے اپنی رکابی کاظم کے سامنے سرکا دی۔ وہ کچھ مجبور سا ہو گیا اور میرے ساتھ کھانے لگا۔

ایک صاحب بولے، ماشاء اللہ ست کولے[1] کھائے جا رہے ہیں۔ کاظم نے سب کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔ یہ ڈومنیاں کیوں خموش بیٹھی ہیں ؟ ایک بولا دولہا بڈھا ہے۔ کاظم نے کہا آپ کو تجربہ ہو گا اور کیوں بندہ نواز کھا ہم رہے ہیں۔ مرچیں آپ کے لگ رہی ہیں۔ کیا زخموں پر نمک چھڑکا جا رہا ہے۔ ماشاء اللہ بڑی گرم گرم باتیں بنا رہے ہو یار ہو رکابی مذہب۔ جہاں دیکھا توا پرات وہیں گزاری ساری رات۔ میاں مُلّانش تم اپنے حلوے مانڈھے سے کام رکھو۔ دوسرے بولے مُردہ دوزخ میں جائے چاہے بہشت میں۔ تیسرے نے کہا دیکھتے رہو مُردہ جنّت ہی میں جائے گا۔

کاظم نے جواب دیا اپنے یار بہشت ارضی کے رضوان ٹھیرے تو اپنے گھرے ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا ہم جانتے ہیں تم بڑے گھرے ہو۔ یہ ذرا گھرے سے بچے رہنا۔ کاظم نے کہا ملاحی چیرتے نکل جائیں گے۔

دوسرے نے جواب دیا بس زیادہ مُلّاحیاں نہ اُڑائیے۔

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار ٭ کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

کاظم بولا آپ کنار سے محروم رہ گئے ہوں گے اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہاں تو کنار بھی ہمارے لئے ہے کنارہ بھی۔

وہ چو مکھی لڑنے والا جواب دینے میں مصروف تھا۔ کھانے سے بے خبر۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ بانکا سپاہیا کہیں بھوکا نہ رہ جائے۔

---

[1] یہ ایک رسم ہے جو نکاح کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ دُلہن دولہا کو کھیر کھلاتی ہے اور دولہا دُلہن کو۔

اس خیال سے ایک کسک سی ہوتی تھی یہ درد میں نے آج پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ شاید آج پہلی دفعہ میرے سینہ میں عورت کا دل دھڑک رہا تھا دل نے دماغ کو احکامات دئے۔ دماغ نے تدبیر نکالی۔ میں دسترخوان پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سب نے وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا آپ لوگ مذاق کیئے جا رہے ہیں۔ ہمیں اُچھو ہو جائے گا۔ ہم باز آئے ایسے کھانے سے۔ مجھے اصرار کر کے بٹھایا گیا۔ وعدہ کیا کہ اب مذاق بند۔ کھانے کے بعد دیکھا جائیگا۔

کسان اور کسان کی بیوی میری آنکھوں کے سامنے آنے لگے اور میں غیر ارادی طور پر اچھی اچھی چیزیں کاظم کی جانب سرکانے لگی۔ لیکن اس افراط میں یہ ایثار محض تماشا معلوم ہوتا تھا۔ شعر تھا جس میں معنی نہ تھے۔ جسم تھا جس میں روح نہ تھی۔ راگ تھا جس میں رس نہ تھا۔ کاش میں غریب ہوتی۔ کاش میں اس ڈرامہ کی سچی ہیروئن ہوتی۔ کاش میں اس لذت سے محروم نہ کی جاتی۔

میں سُسر کو اس عُسر پر نثار کر دینے کو تیار تھی تمام راحت اس کلفت کی نذر کر دینے کو حاضر۔ دولت اس غربت پر نچھاور کر دینے پر آمادہ۔ تمام سُکھ اس دُکھ پر تج دینے کو موجود تھی۔

عورت کی طینت زمین کی سی ہے۔ بوجھ اُٹھانے میں راضی۔ خاکساری میں خوش سینہ پر پالنا اسکی خلقت۔ اپنی سوتوں سے آبِ حیات بخشنا۔ اس کی عادت دُکھ میں سُکھ محسوس کرنا اس کی خصلت قربانی اس کے خمیر میں۔ ایثار اس کے ضمیر میں۔

جب کسان کو ابرِ رحمت ترسائے۔ زمین اپنا سینہ شق کر کے پانی بہم پہنچائے۔ مرد پر جب آفت آئے۔ عورت آغوشِ راحت لیئے اس کے پاس پہنچ جائے۔ تھک کر مزدور زمین پر آرام پائے۔ دُکھ درد سے مرد کو نجات عورت کے پہلو میں ملے۔ یہ اولوالعزم درماندہ ہو کر زمین پر سہارا لیتا ہے۔ یہ دنیا کو سر پہ اٹھانے والا اسرِ پابوس عورت کے سینہ پر ٹکاتا ہے۔ مر کر انسان زمین میں ٹھکانا پاتا ہے۔ تھک کر مرد عورت کے پاس سکون حاصل کرتا ہے۔

آخر کھانا ختم ہوا۔ دسترخوان بڑھایا گیا۔ کاظم مجھ سے دور جا بیٹھا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ چندے یگانہ پھر بیگانہ نظر آیا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک فصل تھا۔ ایک خلیج تھی۔ ایک بُعد تھا جو عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب ہم واپس ہوئے۔ محفل درہم و برہم ہو گئی ایک خواب تھا جو خوابِ بے تعبیر ہو کر رہ گیا۔

طوائف کی عید

آج عید ہے۔ سارے بازاروں میں دکانیں سجائی گئی ہیں۔ اس بازار میں عورتیں سجا سجا کر بٹھائی گئی ہیں ——— بردہ فروشی قانوناً ممنوع ہے عصمت فروشی جائز۔

سب چیزیں دن دہاڑے کھلے ڈے خریدی جاتی ہیں۔ یہاں کی گاہکی اندھیارے میں منہ چھپا کر ہوتی ہے۔

ایک آتا ہے تو دوسرا چھپ جاتا ہے۔ زینہ میں مٹ بھیڑ ہو جائے تو رومال حائل آتا ہے۔ دنیا بڑی پردہ دار ہے۔ عجب آنکھ مچولی ہے باپ کو بیٹے کی خبر نہیں بیٹے کو باپ کی۔ والد بزرگوار کہاں شوق فرماتے ہیں اور فرزندِ جواں سال کس دکان سے خرید فرماتے ہیں یہ سب پردۂ راز میں ہے۔

دکانیں تھوڑی ہیں اور گاہک بہت دستِ قدرت اکثر باپ بیٹوں کو ایک ہی تھڑی پر لا کھڑا کرتا ہے لیکن پردہ دار سماج نقاب لئے کھڑا رہتا ہے۔ کیا مجال جو ایک کی دوسرے کو خبر ہونے دے۔

یہ پردہ سماج کی عقلوں پر پڑا ہے۔ یہ پردہ داری نہیں حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔ صداقت کو نقاب پوش کرنا ہے۔

یہ پردہ داری نہیں۔ روشنی دکھانے والی شمع پر غلط شرم و حیا اور چشم پوشی کا دھندلا فانوس ڈھک کر گناہگاروں کی ہمت افزائی کرنی ہے۔

چشم حقیقت نگر کی آنکھوں میں مرچیں جھونکنا سچ کو چھپانا اور دروغ کو فروغ دینا ہے۔

بیوقوف سماج تو نے رنڈی کو دشمن سمجھا تو نے اس کے لئے صرف تاریکی میں گنجائش چھوڑی تو نے اسے گندا سمجھا۔ گندا رہنے دیا اور ایک طرف لے جا ڈالا تو نے اسے بیمار تشخیص کیا اور بیمار رہنے دیا ——— اس نے تیری دنیا تاریک کر دی۔ تیرا ماحول گندا کر دیا۔ ہر پاس سے گذرنے والے کو بیماری دی۔ اندھیرے نے یہ مزید فائدہ بخشا کہ رنڈی نے باپ کا ورثہ بیٹے کو پہنچایا۔

معاشرہ کی پردہ داری اس وبا کو پھیلانے میں

معاون ہوئی۔ تاریکی نے انسدادِ سرقہ نہ کیا۔ چور کو دیدہ دلیر بنا دیا۔

سماج تو بیماروں کے لئے شفاخانہ کھولتا ہے تو غلط کاروں کے لئے جیل خانہ بناتا ہے۔ تو ہر گندگی کی صفائی کا ذمّہ دار ہے اور اپنا فرض ادا کرتا دیکھا گیا ہے۔ تو انسان کی جسمانی صحت کا خیال کرتا ہے۔ سڑی ہوئی ترکاریاں نہیں بکنے دیتا۔ لیکن تعجب ہے تو نے وہ بازار قائم کر رکھا ہے جہاں اخلاقی اور جسمانی بیماریوں کا بیوپار ہو رہا ہے۔

سماج تو اندھا نہیں۔ بیوقوف نہیں۔ دیوانہ نہیں۔ تو نے جو آج تک اس گندگی کو برداشت کیا اب بھی کر رہا ہے اور آئندہ بھی کرے گا اسکی کوئی وجہ ضرور ہے۔ کوئی جذبہ ہے جو تجھے اس کے ختم کرنے سے روکتا ہے اور روکتا رہے گا۔

سماج! طوائف کی بقا اس میں مضمر ہے کہ تیرے بنانے والے رنڈی باز ہیں۔ معاشرہ کے سرپرست طوائف پرست ہیں۔ سوسائٹی کا سنگِ بنیاد رکھنے والے ہاتھ۔ اپنی بُری عادتوں کے ہاتھوں دست زیرِ سنگ ہیں ——

آبائے شہر ہم سے ابنائے شہر کو کیا بچائیں گے
خود ہمارے دامِ الفت میں گرفتار ہیں۔

رنڈی کا وجود اس وقت تک نہیں مٹایا جاسکتا جب تک مردوں کی طینت نہ بدل دی جائے۔ جب تک مردِ بوالہوس رہیں گے طوائف دنیا پر مسلّط رہے گی —— لیکن

ہوس اور مرد مترادف ہیں۔ ان میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہوس مرد کی طینت میں ہے خلقت میں ہے۔ گوشت سے ناخن جُدا نہیں ہوسکتا۔ گِدھ سے مُردار خواری نہیں چھڑوائی جاسکتی۔ خنزیر کو گندگی سے دور نہیں رکھا جاسکتا —— بندر کو سدھایا جاسکتا ہے۔ انسان نہیں بنایا جاسکتا۔ بید لئے کھڑے رہیئے کرتب دکھاتا رہے گا۔ ذرا چھوڑ دیجئے۔ تدغن اٹھا لیجئے بید چھپا لیجئے فطرت عود کر آئے گی۔

مرد حیوان ہے اور حیوان رہے گا۔ منبر اور پلیٹ فورم پر ہوسِ عزّ و جاہ کے دزّہ کرتب کرواتے ہیں۔ سکھائے پڑھائے سبق دُہرواتے ہیں منظر بدلا اور اس نے وحشت کی لی ——

یہ حیوان سرشت۔ وحشی نژاد درندہ صفت اپنے پنجے سکیڑے دانت چھپائے حقیقت پر عبا اور قبا کے پردے ڈالے گربۂ مسکیں بنا پھرتا ہے ورنہ

چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

رنڈی کے ہاں فریب کے پردے اٹھائے جاتے ہیں۔ تلک کی لکیریں ماتھے پر سے دھو کر پاپ کے نشان دکھائے جاتے ہیں۔

یہاں خواہشات کے پنجوں سے گریباں پھاڑ کر سینہ کے داغ گنائے جاتے ہیں۔ جذبات کے خنجر سے سینہ چاک کر کے دل کے دَھبّے بتائے جاتے ہیں۔

خواہشات کی انگیٹھی پر ایک آنچ میں مُلمّع اُتار دیا جاتا ہے۔ یہاں دام تزویر نہیں چلتا۔ کھوٹا کھرے کے مولوں نہیں بکتا۔ یہ عریانی کی دنیا ہے۔ ہمارے روبرو ہر شئے برہنہ لائی جاتی ہے۔

آج عید ہے۔ سڑکوں کی کچھ دن پہلے سے درستی کی گئی ہے۔ تمام داغ بھر دئے گئے۔ عید کے دن ٹریفک زیادہ ہوگا۔ نئے زخموں اور داغوں کے لئے گنجائش بنائی گئی ہے۔

اندھیرے سے سڑکوں کو جھاڑ پونچھ دھودھا کر تیار کر دیا گیا تاکہ دُنیا اسے دل کھول کر گندا کرے ــــــ ازاں جملہ رنڈیاں بھی نہلا دُھلا سجا بنا کر بٹھا دی گئیں ــــــ دُنیا کی عید ہے۔ ہر شئے صاف کی گئی ہے تاکہ دنیا والے اسے گندا کریں۔ ہر چیز درست کی گئی ہے تاکہ ابن آدم اسے پھر کے سے توڑے ــــــ انسان آج بھی خورد سال بچّے کے مانند ہے اور سماج اُس کی ناز بردار دوا۔ کھلونے سجا کر رکھتی ہے تاکہ بچّہ آئے اور انہیں توڑے۔

سڑکوں کی بھی پہلے سے مرمّت کر دی گئی۔ آج ان پر ٹریفک زیادہ ہوگا۔ رنڈیوں کے بھی علاج رمضان بھر ہوتے رہے۔

ماہِ صیام میں ایک حکیم صاحب کے ہاں گئی تھی حکم آیا تھا۔ یہ ہمارے معالج ہیں۔ فوراً گئی۔ ان سے کام پڑتا رہتا تھا۔

احباب جمع تھے ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ ایک صاحب بیٹھے دوا کھرل کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کیا تیار ہو رہا ہے۔ فرمایا عید کے لئے دوا۔ اس جواب کے ساتھ زیر لب مُسکرائے بھی۔

یہ دوائیں بیچتے ہیں ہم حُسن ــــــ ہم اپنے رُخِ تاباں سے جذبات میں آگ لگاتے ہیں۔ یہ اپنے کشتہائے سوزاں سے خواہشات کو بھڑکاتے ہیں ــــــ ہماری ادائیں دنیا کو مائل بہ گناہ کرتی ہیں ان کی دوائیں ــــــ چاوڑی کی نائکہ رنڈی کو بناتی سنوارتی ہے یہ تماشبین

کواُبھارتے ہیں۔

کام دونوں کا ایک ہے۔ ایک ذلیل ایک
عزّت دار۔

لیکن یہ مرضوں کا بھی علاج کرتے ہیں
______ کاش صِرف اتنا ہی کرتے یہ قابل
پرستش ہوتے اگر اپنا دائرۂ عمل یہیں تک
محدود رکھتے۔ یہ مسیحی کہلاتے اگر صرف بیماریوں
سے نجات دلاتے ______ لیکن یہ ملذّذات
بھی بیچنے لگے، فلک سیر بھی۔ ان کے نام سے حیاسوز
اشتہار بھی نکلنے لگے رسالہ بھی۔

دنیا اسی کا نام ہے طب علاج الامراض تھی وجہ
امراض بن گئی۔

اطبّاء بیماری کا شکار کرنے پیدا ہوئے تھے
خود خواہشات کے شکار ہو گئے۔

مشاطۂ تمدّن نے جسے ہاتھ لگایا مبتذل بنایا۔
موتی کی آبرو کھوئی مروارید سیال بنا کر ـــ
فولاد کو پھونک کُشتہ کر دیا۔ جو سرِ میدان جوہر
دکھانے آیا تھا تخلیہ میں کام آیا۔

دُنیا کی ہر شئے صِنفِ قادر کی غلام ہے وہ
اسے جس طرح چاہے استعمال کرے ______
لیکن اے دور روزہ عارضی قادرِ قدرت اپنا کام
کر رہی ہے۔ تو نے فولاد کی تلوار نہ بنائی۔ اسے پھونک
دیا وہ تیرے قبضۂ قدرت میں تھا۔ غلام تھا قدموں
میں آن پڑا۔ لیکن اندھے آنکھیں کھول فولاد
قدموں میں پڑا دلے غلامی کی زنجیر گراں بن کر۔

تیری ہوس نے موتیوں کو پانی کر کے بہا دیا
وہ بوند ابرِ نیساں نہ بنی مبدّل بہ عرقِ انفعال ہوئی۔

دُوا بن رہی تھی۔ عید کی تیاریاں ہو رہی تھیں
عیّاشی کے آلے گھڑے جا رہے تھے۔ طب سے
دلالی کا کام لیا جا رہا تھا ______ یاقوت
اور زمرّد عصمت کا خون بہانے اور پارسائی میں
زہر ملانے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔

ختن سے مشک لایا گیا تھا کشمیر سے زعفران
خدا کی نعمتیں اکٹھی کر کے اہتمام گناہ کیا جا رہا تھا۔

سقنقور نیل فراہم کی تھی سیاہکار قلزم معصیت
میں نہانا چاہ رہے تھے ______ پہاڑوں
کے سینے چیر کر سم الفار حاصل کی گئی تھی۔ ضمیر کو
دائمی نیند سُلانے کی تدبیر تھی۔

ضمیر کو سلانے والے تو قانونِ قدرت کو نہیں
سُلا سکے گا۔ یہ زہر تیرے اور تیری اولاد کے رگ و
پے سے پھوٹے گا ______ زعفران کے
کھیت میں جانے والے یہ خوشبو تجھے اتنا ہنسائے گی

کر تو ردوے گا ——— ہرن کی ناف چیر کر مشک لانے والے یہ دورِ عیش تجھ سے رم کر جائے گا۔

چار دن کی چاندنی پر نہ پھول اندھیاری آنیوالی ہے۔

کبوتر خصال۔ آشتی اندیش معاشرہ نے گربہ پا بُرد آز ماقدرت کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں تو بے خبر ہے اور وہ گھات ہیں۔ تو سوتا بنا ہے اور وہ شب خون مارنے تیار کھڑی ہے۔

تو ہلالِ عید دیکھ کر مسرور ہے اور دستِ قضا نے تیغ آبدار سونت رکھی ہے۔

عید ہے۔ مہینہ بھر کے پیاسے مے آشام آج دل بھر کر دل کی لگی بجھائیں گے۔ کلیدِ میکدہ خم چرخ پر رکھی نظر آگئی۔ جام پہ جام لنڈھائیں گے۔

دورِ پارسائی گذر چکا۔ ماہ صیام نے اختتام پایا۔ دورِ معصیت آیا ہے۔ اب نیکیوں کا ردِ عمل دیکھو میں نے بھی کپڑوں پر چاندی بکھردادی۔ مجھ پر سونا نچھاور کیا جائے گا۔ سودا بُرا نہیں ہے سودائی آنے والے ہیں تیار ہو بیٹھ۔

زہرہ کے مشتری آئیں گے۔ مہینہ بھر کی نیکیاں گناہ کی بھینٹ چڑھائیں گے۔

معصیت کی دیوی دلفریب بنکر بیٹھ تیرے پجاری آرہے ہیں۔

پاپ مندر کی داسی سنگھاسن پر براج۔ تیرے داس آئیں گے چرنوں پر پھول چڑھائیں گے تجھ پر روپا برسائیں گے۔

گاہک آئے اپنی اپنی پونجی لائے۔ بزرگوں کا اندوختہ۔ بیوی کا زیور۔ بال بچوں کا حق کاٹ کر لائے۔ ان کو رُلا کر لائے۔ کسی نے باپ کے صندوقچے میں سے چُرایا۔ کسی نے ماں کی تھیلی میں سے۔ ایک نے بہن کے جہیز کا دوپٹہ اُچکا لیا۔ صرّاف کے ہاں کوڑے کر ڈالے۔ بہن غریب نے تو عید کے دن اس ڈر سے نہیں اوڑھا تھا کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔

لوگ آتے رہے ٹیکس دیتے رہے۔ مِن برستا رہا۔ تھالی بھرتی رہی۔ استادوں کے گھر سے تھے زہرہ کے پو بارہ۔

چھ بجے ہورن کی آواز آئی۔ میں سب کو چھوڑ چھاڑ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پارٹی ہے۔ کاظم آئے گا۔ زہرہ جائے گی۔ نقصان کر کے جائے گی۔ گاہکوں کو بگاڑ کر جائے گی ——— یہ دل کے سودے ہیں یہ سودا ہی اور ہے۔ یہاں کھونے میں مزا ہے ہم اندھے جواری ہیں۔ ہر رنڈی جواری ہے راجہ نل نے عزت لگا دی۔ جواریوں میں نام کر گیا سچ پوچھو تو ہر طوائف راجہ نل ہے اس بساط پر

عزّت اور عصمت کا سرمایہ لیکر آتی ہے اور اندھی جوانی قدم قدم پر لگاتی چلی جاتی ہے۔

میں باغ پہنچی۔ کاظم موجود تھا۔ ایک صاحب آگے بڑھے اور بولے :۔

عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم
رسمِ دُنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

یہ شعر یقیناً جناب نے آج صبح سے کئی مرتبہ ازبر کیا تھا لیکن گھٹیا کمپنی کے بُرے ایکٹر کے انداز سے پڑھا میں نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

رنڈی شرما رہی ہے اور گلے ملتے ہوئے قربان جائیے۔ ایک ایک آتا گیا ملتا گیا۔ جیسے ہوٹل کی میز پر سے کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں۔ میں ساڑی کو بار بار درست کرتی رہی جیسے بہرہ ہر گاہک کے بعد میز جھاڑ دیتا ہے۔

کاظم دور کھڑا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ضرور آئیگا لیکن وہ ٹل گیا۔ ایک روش پر ٹہلنے نکل گیا میری نگاہیں مایوس لوٹیں اور پلکوں کی سیاہ چادر میں لپٹ گئیں۔ میں کاظم کے تصوّر میں سب سے گلے ملتی رہی۔ لیکن احساسات جاگ رہے تھے دل کی آنکھیں کھلی تھیں کاش وہ بھی بند ہو جاتیں اور زہرہ صرف گلے ملنے کی مشین بن کر رہ جاتی۔

کوئی تکلف سے مل رہا تھا۔ کوئی بھیچ بھیچ کر کسی نے عطر مل رکھا تھا لیکن مُنہ کی بدبو نہ چھپا سکا ایک کے بٹن سینہ میں چبھے۔ ایک سنڈے نے زمین سے اُدھر اٹھانا چاہا۔ غرضکہ زہرہ چندے دست بدست خلائق بن رہی۔

سُنا ہے حوریں روزہ داروں کی خدمت کو آتی ہیں۔ ہماری متمدن دُنیا امنّت کش مخلوقِ فلکی نہیں حور وش مہیا کر لیتے ہیں۔ اس امید موہوم پہ ان حقیقت پرستوں کا ایمان نہیں۔

عید کا دن ہے لوازمات عید پورے ہونے لازم۔ بوتلیں کھلیں جام گردش میں آیا۔ دنیا لڑکھڑائی۔ زہرہ درار کا سر چکرایا۔ زہرہ زمین نے رقاصہ فلک کو ٹھکرایا۔

بزمِ طرب دیکھ کر فلکِ طرب دشمن کے سینہ پر ستارہ آبلوں کی طرح نمودار تھے۔ یا گناہ خاکیاں پر فلکِ پیر آنسو ٹپکا رہا تھا شہابِ ثاقب برسا رہا تھا۔ دُنیا کے عیش دیکھ کر کروبیوں کی آنکھیں جھک اُٹھی تھیں یا داروغۂ دوزخ نے انگارے تیار کئے تھے۔ آسمان کے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا یا پیش رفتگان وارفتگاں کے مشاغل دیکھ رہے تھے کہ زہرہ نے یہ غزل شروع کی۔

ساقی بیار بادہ کہ ماہِ صیام رفت
دردہ قدح کہ موسمِ ناموس نام رفت

غزل زبان پر صُراحی ہاتھ میں گھونگرو پیروں میں بندھے تھے۔ میں گاتی جاتی۔ ناچتی جاتی پلاتی جاتی چھلکاتی جاتی تھی۔ پی رہی تھی۔ پلا رہی تھی۔ متوالی تھی نشیہارا بنا رہی تھی۔

جام ہاتھ میں تھا، شراب ہونٹوں پر۔ سُر گلے میں مچل رہے تھے۔ رقص پیروں پر کھیل رہا تھا شیطنت کا بھوت سر پر۔

میں یہ شعر گاتی ہوئی کاظم کی طرف بڑھی:۔

وقت عزیز رفت بیا تا قضا کنیم
عمرے کہ بے حضورِ صُراحی و جام رفت

اس کے پاس جا بیٹھی۔ میں نشہ میں تھی۔ بُری بھلی شراب کے سر جائے گی۔ رنگی ہوئی ہوں رنگ کر اُٹھوں گی۔ بدنام جام ہو گا۔ مُنھ سے گلاس لگا دیا اس نے انکار کیا میں نے یہ شعر گایا۔

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ
رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

اہلِ بزم نشہ میں چور مست پینے پلانے پر کمربستہ۔ میری حمایت پر آمادہ۔ کاظم مجبور ہو گیا پے بہ پے کئی پینے پڑے۔ میرا سہارا لے کر اُٹھا۔ ہم دونوں اُستادوں کے روبرو جا بیٹھے۔ ظالم نے ایک عجیب انداز سے یہ شعر گایا:۔

نقدِ دلے کہ بود مرا صرفِ بادہ شد
قلبِ سیاہ بود ازاں در حرام رفت

اس کے بعد فوراً یہ غزل شروع کی:۔

دل بدنیم شدہ دلبر بملامت برخاست
گفت با ما منشیں کز تو سلامت برخاست
کہ شنیدی کہ دریں بزم دمے خوش بنشست
کہ نہ در آخر صحبت بندامت برخاست

مجھے کامیابی کا نشہ چڑھا تھا۔ کاظم کو پلائی تھی اس نے ختم کی اور میں نے شروع:۔

مے پرستوں میں جو گھر جائیے گا
بچ کے مستوں سے کدھر جائیے گا
لالہ رخساروں میں گر آئیے گا
داغ سینہ پہ مگر کھائیے گا
ہاتھ گل پہ جو پڑے گا صاحب
خار سے بچ کے کدھر جائیے گا
میکدہ ہے یہ نہیں ہے مسجد
چھینٹے دامن پہ لئے جائیے گا

طوائف

بجلی آکاش کا سینہ چاک کر رہی تھی۔ جذبات میرا دل چیرے ڈالتے تھے۔ ابر پریم رس برسا رہا تھا آسمان پر سیاہ بادل چھائے تھے۔ دنیا پر سیاہ کاری میرے دل کو جذبات کے دھوئیں نے گھیر رکھا تھا۔

برسات تھی۔ بلبل کو گل کی تلاش تھی۔ شمع پروانہ کے لئے جل رہی تھی۔ سرو سر اٹھائے قمری کو دیکھ رہا تھا۔ میری طرف بھی ایک بھونرے نے دیکھا۔ مدھو بنسری سنائی ——— میں مست متوالی اس کے ساتھ ہو لی۔ اس نے ڈنک مارا رس چوس لیا۔ میری رگ رگ میں زہر سرایت کر گیا۔

برسات کا موسم تھا۔ ابر جھوم جھوم کر آتا۔ زمین پر بوند پڑتی۔ یہ خاک کی دیوی اپنا سینہ چاک کر لعل اُگل دیتی اور بوند کے لئے جگہ بناتی تھی نہ لعل رہتے نہ بوند۔ پھر وہی خاک کی خاک۔ برسات تھی پروانے شمع پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ چیونٹی کے بھی پر نکل آتے۔ میرے بھی پر نکل آئے۔ نہ چیونٹی رہی نہ میں۔

بلبل گل کی طرف بڑھا۔ اس نے سینہ چاک کر کے خیر مقدم کیا۔ بلبل ہری چگ تھا۔ چلتا ہوا پھول کملا گیا۔ مر گیا۔ خاک میں مل گیا۔

سورج مغرب کی طرف بڑھا۔ مغرب نے اپنا خون اس کے قدموں میں چھڑکا۔ اس شوخ گرم گرم کو سینہ سے لگا لیا۔ سورج رات کی رات وہاں رہا۔ پھر مشرق سے جا نکلا ——— یہی لیل و نہار ہے یہی روز و شب کی داستاں۔

اب میں سرِ راہ سلگتی ہوئی انگیٹھی ہوں سرد مہر راہ گیر ہاتھ سینک کر جاتے رہتے ہیں۔ میں جلتی رہتی ہوں۔

میں ایک سڑک ہوں شارع عام۔ مجھ پر سے دنیا گذرتی ہے۔ لوگ روندتے ٹھکراتے۔ خاک اُڑاتے چلے جاتے ہیں اور میں تنہا پڑی رہتی ہوں۔ جب میلے تماشے ہوتے ہیں۔ میں زیادہ ٹھکرائی جاتی ہوں دنیا کی عید میرے لئے عذاب ہے۔ راہرو میرا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ آرام پاتے۔ اپنی راہ چلے جاتے ہیں۔ میں خس و خاشاک سرِ راہ ہوں۔ مسافر سلگاتے ہیں۔ ہاتھ

ناپتے ہیں اور مجھے جلتا چھوڑ جاتے ہیں میں اپنی چنگاریاں ہوا میں اڑا کر جنگل بھر پھونک دیتی ہوں۔ دنیا مجھے بُرا کہتی ہے اور آگ لگانے والا ہاتھ کہیں اور آگ لگانے معصومانہ چلا جاتا ہے۔

ایک الاؤ میں دو اینٹیں پکتی ہیں۔ ایک گندی موری میں لگتی ہے۔ دوسری قصر شاہی میں ——
ایک پھول کی دو پتیاں ہیں ایک نوشاہ کے سہرے میں جگہ پاتی ہے دوسری بوالہوس بدمستوں کے گھٹنوں کے نیچے پس کر سیجوں پر دم دیتی ہے ——
ایک ابر سے دو قطرے ٹپکتے ہیں۔ ایک سیپی کی حفاظت میں موتی بن جاتا ہے دوسرا موجوں کی ٹھوکروں میں پامال ہو جاتا ہے۔ قطرہ بے بس ہے۔ حادثات کارساز و کارفرما —— بیک وقت دنیا دو لڑکیاں دیتی ہے زمانہ ایک کو ماں بناتا ہے۔ دوسری کو رنڈی۔ ؎

در کوئے نیکنامی مارا گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

میں ماں بننے آئی تھی۔ رنڈی بن گئی۔ امرت تھی زہر بنا دی گئی۔ گھر تھی گھر والی تھی سرا بن گئی اور سرا کا بستر۔ ایک مرد نے مجھے تباہ کیا۔ میں اس نسل کو تباہ کر رہی ہوں۔ مرد میرا کھلونا ہیں۔ کٹھ پتلیاں کاٹھ کے گڈے۔ کاٹھ کے اُلّو۔ میں دوست سے دوست کو لڑا دیتی ہوں۔ بھائی سے بھائی کو میرے لئے بیٹا باپ کا مرنا چاہتا ہے۔ میاں بیوی کا زیور چرا لاتا ہے۔ میری آنکھوں میں نشہ ہے اور میں دنیا کے مردوں کو بدمست بنا رہی ہوں۔

میں رنڈی ہوں رنڈی اگر بھنگن کو بھنگن کہو تو خفا نہیں ہوتی۔ رنڈی کہو تو بگڑ بیٹھتی ہے۔

میری بہنیں مجھے ذلیل سمجھتی ہیں۔ ذلیل ان کے عزت والے باپ ہیں بھائی ہیں۔ میاں ہیں جنہوں نے مجھے ذلیل بنایا۔ میں ان کو ذلیل کرتی ہوں۔

انہوں نے میری زندگی تباہ کی ہیں ان کی دنیا تباہ کرتی ہوں —— انہوں نے مجھے رنڈی بنایا۔ میں رنڈی بنی۔ قانون قدرت نے ان کو اسی رنڈی کا غلام بنایا اسی ذلیل کے ہاتھوں ان مصنوعی عزت داروں کو ذلیل کرایا۔ چاہ کن را چاہ درپیش۔

مرد میری بیماریوں سے ڈرتے ہیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ مگر رکھتے ہیں۔ پچھتاتے ہیں۔ پھر آتے ہیں —— میری آنکھوں میں ناگن کی سی کشش ہے۔ بھنگا آنا نہیں چاہتا پر آتا ہے۔ کبھی میں بھنگا تھی مجھے ایک سانپ نے ڈسا۔ اب میں ناگن ہوں اور بنی نوع مرد کو ڈستی ہوں۔

برسات آئی۔ پیاسی زمین نے پانی پیا۔ میں دکھیاری پیاسی ہی رہی۔ لوگ آئے۔ بوتلیں لنڈھائیں جنگلوں میں گئے باغوں میں پہنچے۔ سب ہنسے میں بھی ہنسی۔ زخم پھٹ پڑے۔ دنیا ہری بھری تھی۔ میرے زخم بھی ہرے۔ اس کسک میں مزہ تھا۔ میں دیوانوں کی طرح ہنس رہی تھی۔ دنیا خوش تھی کہ میں خوش ہوں۔ میں خوش تھی کہ دنیا کو اندھا بنا رہی ہوں —— کبھی میں مردوں کا تختۂ مشق تھی۔ آج مرد میرے تختۂ مشق ہیں۔

مجھ پہ ایک خول چڑھا ہے۔ لوگ اس خول تک رسائی پاتے ہیں اور خوش خوش چلے جاتے ہیں۔ کسی کے ہونٹ میرے رخساروں تک نہیں پہنچتے میرے رخساروں پہ سرخی، پاؤڈر، کریم اور فاؤنڈیشن کریم کے ردّے رکھے ہیں۔ میرے ہونٹوں کی حفاظت کس پروف لپ سٹک کر رہی ہے۔ میرے دل و دماغ پہ انتقام کا خود چڑھا ہے۔ نہ کوئی میرے ہونٹوں تک رسائی پا سکتا ہے۔ نہ دل تک طلبگارِ ظاہری میرے پاس آتے ہیں۔ ظاہر پرستی کر کے چلے جاتے ہیں۔

میں ایک حساس بانسری ہوں جو دوسرے کے سانسوں سے بجائی جاتی ہے۔ دوست کے ہونٹوں سے ناآشنا۔ دنیا کہتی ہے کہ زندہ ہم اس کی عنایت سے ہے۔ دنیا اندھی ہے۔ پر خوش ہے۔ کاش میں بھی اندھی ہوتی۔

دنیا کو میرا گانا ناپسند ہے۔ دنیا کی نظروں میں میری حقیقت گراموفون ریکارڈ سے زیادہ نہیں۔ دنیا نہیں جانتی کہ ریکارڈ کے سینے میں سوئی چبھتی ہے جب نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ اس ردسیاہ کے دوران سر پہ دنیا سر دھنتی ہے۔

یہ عصمت دریدہ لوٹا ہوا پیالہ لئے دنیا کے میلے میں بھیک مانگ چکی۔ یہ گوشت کی گڑیا کھیل چکی کھلا چکی۔ اپنی ایک بھول کا بدلہ دے بھی چکی۔ لے بھی چکی۔ یہ دریا کی بہتی ہوئی بٹیا امواج کا اتار چڑھاؤ دیکھ چکی۔ یہ شمع رات کی گرمجوشی بھی دیکھ چکی۔ اور صبح کی سرد مہری بھی۔ یہ سیپی آبرو لوٹ بھی چکی لٹا بھی چکی۔ اب سکون کی طالب ہے۔ میلے کی ناچنے والی تھک گئی۔ تماشائی چلے آتے ہیں۔ یہ گردش کب ختم ہو گی۔ یہ چکر کب نکلے گا؟

لغزش

کالی گھٹائیں بجلی کچھ اس طرح کوندر ہی تھی جیسے کسی کا شوخ شباب سماج کے دبیز پردے چاک کرنے کی ناکام کوشش کے بعد پھر ان میں سما کر رہ جائے۔

سیاہ بادل اس شباب زدہ کی بیتابی پر لٹورے سادھوؤں کی طرح جھوٹے آنسو بہاتے اپنی راہ چلے جا رہے تھے۔

فضا پر شباب تھا۔ ہوا میں شراب۔ بادہ نوشی تھی۔ باد دبیائی۔ کویل کی کو کو تپش جستجو پیدا کرتی۔ پپیہے کی پی کہاں جذبات موجودات کی ترجمان تھی۔

غنچے آغوش تمنا وا کر رہے تھے۔ گل انتظار بلبل میں چشم براہ۔

فرشتوں کی راہ سیاہ بادلوں نے روک دی تھی۔ عالم خاک پر اہرمن کا تسلط تھا۔ ابر مینہ برسا رہا تھا۔ اندھا دیوتا تیر شباب تردامن کھڑا تھا رہا تھا۔ دل کی لگی بجھا رہا تھا۔

جھولے پڑے تھے۔ رسیاں ہاتھ پھیلائے کسی کی طرف بڑھتیں اور پھر اپنے مرکز پر آن ٹکتی تھیں۔

فضا میں موسیقی گونج رہی تھی۔ شانت اور شرنگار رس اس طرح گتھے تھے جس طرح دو صنفیں ایک دوسرے میں غرق ہو جائیں۔

CUPID (کیوپڈ) اور VENUS ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اٹکھیلیاں کرتے پھرتے تھے۔ وہ اندھے کو راہ بتاتی وہ حسن بہار افروز کو شعلہ فشانی سکھاتا۔

حسن و عشق کی بدلی چھائی تھی۔ جذبات کا مینہ برس رہا تھا۔

ہم سہیلیاں کانتا کے باغ میں جھولا جھول رہی تھیں۔

آج شیلا کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ غائب غائب۔ ہر آہٹ پر کچھ چونک پڑتی۔ ہر آواز پر جاگ سی اٹھتی۔

ایک سیٹی سنائی دی۔ اس میں ایک رس تھا مٹھاس تھی کشش تھی۔ دلبری تھی۔ شیلا کی آنکھیں

روشن ہوگئیں۔ چہرہ چمک اٹھا۔ وہ ایک طلسم زدہ معمول کی طرح اپنے عامل کی طرف بڑھی۔

کرشن مرلی بجا رہا تھا۔ رادھا مست چلی جا رہی تھی۔ کہربا کھینچ رہا تھا۔ برگِ کاہ کھنچا جا رہا تھا بجلی کی مثبت اور منفی لہریں ایک دوسرے میں مدغم ہونے کے لئے بڑھ رہی تھیں جن کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہ سکتی تھی۔ یہ سیٹی نہ تھی صُور تھا جو جسدِ خاکی کو اس کے مرکز کی طرف بلا رہا تھا۔

سب اپنی اپنی دھن میں گیت گا رہی تھیں میں شیلا کے پیچھے ہولی۔

آدم و حوّا ہم آغوش ہوئے۔ ایک جسم کے دو حصّے کچھ اس طرح ملے کہ ایک ہوگئے۔ حُسن و شباب کے پھول ایک لڑی میں پرو دئے گئے۔ صحرائے فرقت کے پیاسے نے چشمۂ وصل پر منہ رکھا۔ شمع پروانہ سے گلے ملی۔

دونوں میں آگ تھی اور ختم ہونے کی نیّت سے ملے تھے۔

شیلا اور نوجوان باغ کی دیوار پر رومیو اور جولیٹ کا افسانہ بنے بیٹھے تھے۔

یہ تلاطم بدوش فضا در آغوش پرسکون منظر میں نے دیکھا دل میں ایک چنگاری پیدا ہوئی۔

فضا نے بھڑکایا۔ شباب نے ہوا دی۔ خوابیدہ جذبات جاگے بمستانہ وار اُٹھے۔ میں لڑکھڑا سی گئی۔ اس لغزش میں مزا تھا۔ ان ٹھوکروں میں لذت تھی۔ اس بیہوشی و خود فراموشی میں لطف فنا تھا اور میں اس سڑک پر ایک شرابی کی طرح چلی جا رہی تھی۔

آج دنیا رنگین تھی یا میں رنگی ہوئی۔ زمانہ نے بانا بدلا تھا یا دستِ قضا نے میرے صحیفۂ حیات کا تازہ ورق الٹا تھا۔ دنیا پر ابر چھایا تھا یا مجھ پر جذبات کی گھٹا طاری تھی۔ ہوا بھیگی بھیگی تھی۔ یا میں تردامنی کی متمنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج قدرت مجھے اندھا بنانے کے لئے اپنی پوری طاقتیں صرف کر رہی ہے اور میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ کوئی ہاتھ عقل پر پردہ ڈال رہا تھا اور میں بھی اسے لوری دے دے کر سلا رہی تھی شمع خودی بجھائی جا رہی تھی اور میں فانوس اٹھا رہی تھی۔ کوئی جام پر جام بھر کر دے رہا تھا اور میں پئے جا رہی تھی۔

سورج نئی دُلہن کی طرح سُرخ کپڑے پہنے حجلۂ مغرب کی جانب بڑھ رہا تھا جبکہ میں گھر میں داخل ہوئی۔

مغربی تہذیب گھر کے ہر فرد کو تخلیہ اور رازداری کا حق دیتی ہے۔ میرا کمرہ بھی الگ تھا۔

میں سنگار میز کے سامنے کھڑی زیور اتار رہی تھی یا دست شباب ایک عورت کی فطری آرائش لوٹ رہا تھا۔

میں نے اپنا جُوڑا کھولا۔ دولٹوں نے میرے چہرے کی بلائیں لیں۔ تاریکی نے روشنی کو گھیر لیا۔ قمر برج عقرب میں آیا۔ یاسمن کے شفاف دامن پہ بھونرے منڈلانے لگے۔

آئینہ میں ایک اور صورت نظر آئی میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک نوجوان رہتا ہے۔ وہ اپنی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اس کا عکس میرے آئینہ میں پڑ رہا تھا یہ ناخواندہ مہمان میرے گھر آ گیا تھا۔ چاند شیشے میں اُتر آیا۔ چکور رک نہ سکی۔

گو عکس تھا حقیقت نہ تھی۔ دھوکہ تھا سچائی نہ تھی۔ سراب تھا پانی نہیں۔ غول بیابانی تھا خضر راہ نہیں۔ آتش نمرود تھی۔ شعلۂ طور نہ تھا۔ فریب تھا اور محض فریب نظر۔ تاہم نہایت خوشنما فریب۔

میرے اندر کوئی چیز ٹوٹتی معلوم ہوئی نازک سا تار کھنچتا سنائی دیا۔ آسمان میں بجلی چمکی۔ شاید مجھے راستہ دکھانا چاہتی تھی پر سخت تاریکیاں چھا رہی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جذبات کی مضراب نے ساز ہستی پہ ضرب کاری لگائی۔ میں مستانہ وار آئینہ کی طرف بڑھی۔

پیشانی پر پسینہ تھا۔ عصمت کا جنازہ اُٹھ رہا تھا۔ عقل اس پہ آخری آنسو ٹپکا رہی تھی۔

چھما چھم مینہ برسنے لگا۔ گرج ہوئی۔ موسیقار قدرت نے اپنے ساز چھیڑے۔ پاک دامنی۔ خواہشات کی چتا پہ ستی ہونے جا رہی تھی۔

میں آئینہ میں اس عکس کو کنکھیوں سے دیکھتی گئی اور کپڑے اتارتی گئی۔ میرے ملبوسات جسم سے لپٹے جاتے تھے۔ جیسے کوئی عزیز اپنے پیارے سے جُدا ہونا نہ چاہتا ہو۔ لیکن ایک طاقت تھی جو انہیں کھینچے لے رہی تھی۔

کالی گھٹا تھی۔ اندھیاری فضا۔ زمانے پہ سیاہی چھا رہی تھی۔ بجلی نے بھی چمکنا بند کر دیا۔ آکاش کے سینہ میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ دریا چھینٹے اُڑا رہے تھے۔ موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ دل و دماغ پر سیلابی کیفیات تھیں۔ عقل و خرد بھی چلی جا رہی تھی۔ ہر چیز کو لغزش تھی۔ ہر شے لڑکھڑا رہی تھی۔ تناور درخت جھوم رہے تھے۔ ہم سے بھی ایک لغزش مستانہ ہو گئی۔

اس روز فطرت کے دیوسیہ مست نے میرے کپڑے جسم سے نوچے تھے۔ آج مجھے گھر سے لئے جا رہا ہے میں نے اپنی راہ پسند کرلی اب اسی پہ چلنا ہے۔ سوئی مقناطیس کے قریب ہوتی جاتی ہے۔ اب روکی نہیں جاسکتی چنگاری شعلہ بن چکی ہے دب نہیں سکتی بھنگا ناگ کے قریب جا پہنچا ہے بچا یا نہیں جاسکتا۔ بال و پر سوختہ پروانہ لو کی زد میں ہے۔ کوشش بے کار۔ پہلے قدم پر روکا جاسکتا تھا۔ اب محال ہے۔ ضمیر کو حکم زباں بندی نافذ ہو چکا ہے۔ عقل کی آنکھیں بند کردی گئی ہیں۔ کمزور انسان نے اپنے کو جذبات و خواہشات کے حوالے کردیا ہے۔ تنکا تلاطم خیز طوفان میں کود پڑا ہے۔ اب تھپیڑے ہیں سیل رواں ہے اور جسم ناتواں۔

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

شکار فتراک میں باندھا جا چکا تھا چڑیا جال میں پھنس چکی تھی۔ اب نہ لاسے کی ضرورت تھی نہ دانے کی۔ فطرت صیاد نے عود کیا وہ دوسروں پہ جال ڈالنے لگا۔ شکاری کی طبیعت نہ بدلی جاسکی وہ پھر شکار کو نکلا۔ مرغ اسیر بے آب و دانہ تڑپتا رہا۔

تلون پسند موہن تلاشِ رنگ و بو کرنے لگا۔

کچھ دن میں اپنے کو دھوکہ دیتی رہی۔ خانۂ صیاد کو آشیانہ سمجھتی رہی۔ آخر دھوکہ اس درجہ صاف و ظاہر ہو گیا کہ خود فریبی بھی نہ چل سکی۔ قفس میں آشیانہ کے خواب نظر آنے لگے۔ پنجرہ کی تیلیاں دیکھتے دیکھتے گھونسلے کے تنکے بن جاتیں۔ مجھے تڑپاتیں اور نظروں سے غائب ہو جاتیں۔

طلسم ٹوٹ رہا تھا حقیقت کھل رہی تھی۔ پردہ اُٹھ رہے تھے۔ سامری اپنا افسوں دوسروں پر استعمال کر رہا تھا۔ پردے ڈالنے والا ہاتھ اپنے کام سے دست بردار ہو رہا تھا۔ اسٹیج کا مجنوں اپنا پارٹ بھولتا جا رہا تھا۔ لیلیٰ تماشائیوں کے روبرو ہکا بکا کھڑی تھی۔

ہوٹل میں گھر یاد آیا۔ غیروں میں اپنوں کی یاد نے ستایا۔ صحرا میں گلشن کے ہیولے نظر آنے لگے۔ بھری پُری دُنیا سونی معلوم ہوئی۔ یہاں میرا اپنا کوئی نہ تھا۔

سامنے سے ایک بچی گزری۔ دونوں طرف سے ماں باپ نے ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ میں رات بھر سو نہ سکی۔ موہن بھی نہ آئے۔

صبح مجھے بخار ہو گیا۔ موہن آیا۔ میں پلنگ پہ پڑی تھی۔ رات بھر کا جاگا تھا۔ سو نے لیٹ گیا۔ مجھے پوچھا تک نہیں۔ عقل کہتی تھی دوا منگوا۔ ڈاکٹر کو بلوا

دل کہتا تھا۔ ایسے سے کیا کہنا آخر بے غیرت بن کر کہا
جواب ملا شام تک اُتر جائے گا۔ دل پر ایک چوٹ
سی لگی۔ کسی نے کہا:۔ بات بھی کھوئی التجا کرکے۔
میں نیم بے ہوش سی ہو گئی۔ حافظہ اپنا کام کرتا رہا۔

ایک رات کوئی دو بجے میرے سر میں درد ہوا تھا
ابا اُٹھ کر دوا لائے۔ اماں لئے بیٹھی رہیں۔ وہ خون
تھا یہ پانی ہے۔

میں نے پانی کو خون کیوں سمجھا۔ کچھ وہ رنگا ہوا
تھا۔ کچھ میں رنگی ہوئی۔ مرد کی طلسم کاری عورت کی
خود فریبی شباب کی جرعہ ریزی۔ جذبات کی تاریکی
عمر کا تقاضہ۔ صحیح نظریہ کی کمی۔ مذہب سے بیگانگی
غلط تعلیم۔ بُری سہیلیوں کا سنگ۔ عاشقانہ افسانوں
کا رنگ ان سب نے مل کر پانی کو کچھ ایسا رنگ دیا
کہ میں آنکھوں کی اندھی سچے خون سے تبادلہ کر بیٹھی۔

بڑی دیوالی آئی۔ پتا میرے بغیر کبھی نہیں جاتے
تھے۔ پتی ساری رات نہیں آئے۔

کیا موہن میرا پتی ہے۔ کیا اس پر میرا کوئی حق ہے
کیا وہ کسی شرائط کا پابند ہے۔

مسافر سایہ دار درخت کے نیچے ٹکتا ہے زمین
پر اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے۔ دھرتی اس کا بوجھ
اٹھاتی ہے۔ جڑیں تک اس وزن کو محسوس کرتی
ہیں مسافر چلا جاتا ہے۔ نہ درخت کا اس پر کوئی
حق نہ دھرتی کا ادھیکار۔ انہوں نے بغیر شرائط کے
اپنے کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اب معاوضہ طلب
نہیں کرسکتے۔

موہن رات کے ایک بجے آیا۔ میں سوتی بن گئی
جوتیاں اتار کر کمرے میں داخل ہوا۔ میری نیند خراب
کرنا نہیں چاہتا۔ میرے پلنگ پر جھکا۔ اس کا گرم
گرم شراب آلود سانس میرے رخساروں نے محسوس
کیا اسے ابھی مجھ سے پریم باقی ہے ——— دیوالی
——— ایک ہاتھ تکئے کے نیچے گیا ———

دل لینے والے نے آج کنجیاں نکالیں۔
پریم پجاری لکشمی بھنڈار میں پہنچا۔

میں دم بخود پڑی تھی۔ سامنے آئینہ تھا۔ موہن
کی ہر حرکت اس میں نظر آرہی تھی۔ الماری کے کواڑ
کھولے زیور کا صندوقچہ نکالا۔ سیدھا ہو لیا۔

میرے اندر ایک چیخ چیخی۔ دل کے ستار کا ایک
اور تار ٹوٹا۔ قلب میں ایک شور برپا ہوا۔ دماغ میں
صدائیں گونجیں گھر کی سنگار میز آنکھوں کے سامنے
پھر گئی۔ میں پھر اپنے ماں باپ کے ہاں اپنے کمرے
میں تھی۔ لیکن ایک لمحہ کے لئے۔

جس کے لئے یہ سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ آج پھر اس کے پیچھے دیوانہ وار چلی جا رہی تھی۔ محبت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا نفرت قدم اٹھوا رہی تھی۔

میری آنکھیں کھل چکی تھیں۔ اندھوں کی دنیا دیکھنے جا رہی تھی۔ مرد تیز گام جھومتا چلا جا رہا تھا۔ زخمی عورت لڑکھڑاتی جاتی تھی۔ موہن آنکھیں بند کئے جا رہا تھا۔ میری انجام پر نظر تھی وہ دل لگانے جا رہا تھا۔ میں دل کی ارتھی تیار کرنے۔ اسے تازہ جام کا نشہ تھا۔ مجھے ماضی کی مایوسیاں ہوش میں لا چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں پر خمار کے پردے تھے میری آنکھوں میں سنکھیا کی چمک۔ اسے تشنگیٔ حیات نے اندھا کر رکھا تھا۔ مجھے موت کی دوربینی نصیب تھی۔ اس کی نگاہ کو اُفقِ مستقبل نے محدود کر دیا تھا۔ میرا مستقبل ماضی میں غرق ہو چکا تھا اس کے آگے سبز باغ تھے۔ میرے سامنے چٹیل میدان۔ مجھے وسعتِ نگاہ نصیب تھی اور وہ کوتاہ بیں۔

اب میں دوسری منورما تھی۔ معصوم منورما اس دن مری تھی جس دن موہن کو پہلے آئینہ میں دیکھا تھا۔ عورت منورما اس دن مری جس دن موہن کو دوسرے آئینہ میں دیکھا۔

وہ بازارِ حسن کی طرف گیا تھا۔ میں دور رہ گئی دل میں تجسس تھا۔ آنکھوں تلاش میں ایک ایک کوٹھے پر چڑھی ایک ایک گھر میں گھسی۔

محبت نہیں نفرت مجھے انگلی مار مار کر چلا رہی تھی۔

میں اس ناگن کو دیکھنا چاہتی تھی جس نے ناگ کے ڈنک مارا۔

میں اس سنپولن کو دیکھنا چاہتی تھی جس نے سپیرے کو ڈسا۔

میں اس زہر کو دیکھنا چاہتی تھی جو سانپ کو چڑھا۔

میں صیّاد کو صید اور شکاری کو شکار دیکھنا چاہتی تھی۔

یہ بازار انتقام ہے۔ یہاں مرد بیوقوف بنائے جاتے ہیں۔ عورتوں کا راج ہے۔ دل و دماغ والیاں ان سیہ کاروں سے اپنا اور اپنی بہنوں کا بدلہ لیتی ہیں۔ یہاں وقارِ مرد حسنِ زن کے در پر سجدہ کرتا ہے بڑے بڑے ہوشیار اپنی کمائی ہوش و خرد کھونے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اس بازار میں کمزور صنف، قوی صنف پر حاوی نظر آتی ہے۔ یہاں عورت، مرد پر قابو پاتی ہے۔ لومڑی شیر سے ماتھا رگڑواتی ہے اس بساط پر فرزیں پیادہ سے مات کھاتا ہے شاہین کنجشک فرومایہ کے چنگل میں نظر آتا ہے۔

یہ دنیا نرالی ہے۔ گھر کے مرد چھپے آنکھیں بچائے
پھرتے ہیں عورتیں صاحب خانہ کہلاتی ہیں۔
اپنے مردوں کی عزّت بیچ کر اُن کی عزّت کراتی
ہیں۔ باپ پر فقرہ کسو تو بیٹی جواب دیتی ہے۔ بھائی کا
خرچ بہن اٹھاتی ہے۔ یہاں مرد امیدیں لیکر آتا ہے
محروم جاتا ہے۔ دستِ سوال دراز کرتا ہے ٹھکرایا
جاتا ہے۔ یہ انتقام کی دنیا ہے۔ یہاں زبردست
زبردست۔ قوی کمزور۔ اور اشرف المخلوقات
اسفل خلائق بنایا جاتا ہے۔

کہیں آنکھوں سے کہیں باتوں سے مست
بنایا جا رہا تھا۔ کہیں رقاصہ محفلوں کو چکر میں
لا رہی تھی۔ کہیں مطربہ متوالا بنا رہی تھی زمانہ شناس
تاجر کھوٹا مال کھرے سے مہنگا خرید رہے تھے۔
کیدِ زن اپنے ہتھیاروں سے آراستہ کھڑا تھا۔
خود مرد دست بستہ شکار ہونے آئی تھی۔

میرا جسم تھک گیا تھا۔ جذبہ اُبھارے لئے
چلا جا رہا تھا۔ آخر چکرا کر ایک اندھیرے زینے
میں گری۔ کوئی مرد ان پر سے اُتر رہا تھا اسکی ٹھوکر
مجھے لگی آنکھ اٹھا کر دیکھا تو موہن تھا۔

دل نے کہا یہ آخری ٹھوکر ہے جو منورما نے کھائی ہے۔
اندر سے ایک ہاتھ آیا اور مجھے اٹھا کر لے گیا
یہ گناہ کا ہاتھ تھا جو مجھے سہارا دینے آیا تھا۔

گردشِ چرخ زمیں آپ کے رک جانے سے
جب سے تم روٹھے ہو آتی ہی نہیں چاندنی رات

چاند جب چرخ پہ چلتا ہوا آتا ہے نظر
یاد آتا ہے کہ دیکھی تھی کہیں چاندنی رات

سبق

پڑوس میں شادی ہے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا عورتیں گوندنی کی طرح زیور سے لدی پھر رہی ہیں۔ کمخواب۔ مشروع۔ اطلس۔ اک رنگے کے ڈھیلے۔ ایک برکے۔ طاؤسی۔ فرشی پاجامہ۔ اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر سر سر کرتے پھر رہے ہیں۔

لوٹ جالی۔ آبِ رواں۔ شبنم کی انگیا۔ کرتیوں کی جھلک جسم کے رونگٹے کھڑے کر رہی ہے۔

پٹا پٹی کی گوٹیں، نیرنگِ عالم کا پتہ دے رہی ہیں۔ تاروں بھرے دوپٹوں میں عارضِ گلگوں سیم کا رصراحی میں مے گلابی کی جھلک دکھا رہے ہیں۔

خود فراموش حسین دیکھت بھولی کے دوپٹوں میں دین دنیا بھلائے دیتے ہیں۔ ماہی پشت کے جال اپنا جال پھیلا رہے ہیں۔

زُلفِ سیاہ کے زیرِ سایہ ماہتابی ماتھوں پہ افشاں معلوم ہوتا ہے۔ ناگ چاندنی رات میں مَن اُگلے بیٹھے ہیں۔ بھویں کٹار۔ مژگاں کالوں کی ڈار۔ چشمِ آہو چوکڑی بھلا دے۔ اس پہ سرمہ کی تحریر خطِ تقدیر۔ گلابی رخساروں میں پیازی موتی کی آب مسی آلود ہونٹھوں میں دُرِ دنداں کی جھلک جیسے نیلگوں آسمان میں کہکشاں کی تحریر یا کویل اپنے پروں میں انڈے لئے ہوئے یا ماریہ کی مٹھی میں لُولُوِ آبدار۔

چاہِ زنخداں کی چاہ کوئیں جھنکائے۔ یوسفِ رُخ

مشروع۔ اطلس۔ اک رنگا۔ کپڑوں کے نام ہیں۔
طاؤسی۔ ایک برکے۔ فرشی۔ پاجاموں کی قسمیں ہیں۔
لوٹ جالی۔ آبِ رواں۔ شبنم۔ کپڑوں کے نام ہیں۔
پٹا پٹی کی گوٹ۔ رنگا رنگ ٹکڑے جوڑ کر گوٹ بنائی جاتی ہے۔

دیکھت بھولی۔ ایک قسم کا جال جس کی وضع نہایت پیچ در پیچ ہوتی ہے۔

تک انسان پہنچنے نہ پائے ۔غب غب سیمیں سونا حرام کردے ۔صراحی دار گردن پر کتابی چہرہ رباعیاتِ خیام کا لبّ لباب ۔

سینۂ صافی صوفی صاف باطن کو سیاہ کار بنا دے ۔ اس پر معکوس بلوریں پیالے دل کی دنیا تہ و بالا کرنے والے ۔

سیلی سیل اشک کا پیام ، سیل فنا کی تصویر
———— جوئے نور میں ناف گرداب بلا ۔

ماتھے پر جھومر خوشۂ پروین ۔چوٹی میں ٹھپّہ کا موباف ۔کالی گھٹا میں بجلی کی چمک یا اوتھیلو کے آغوش میں ڈسڈمونا ۔یا شیرازی کبوتروں کا جیپ جوڑا مصروفِ اختلاط ۔یا شام و سحر گلے ملتے ہوئے ۔

کانوں کی بجلیاں ، بجلیاں گرائیں ۔کرن پھول آفتابِ رُخ کے قریب کرن کے مترادف ۔جڑاؤ بالے بالے مکھڑے پر بلا گرداں ۔

ناک میں ہیرے کی لونگ جیسے کہکشاں پر عیوق

یا چمپا کی کلی پر شبنم کا قطرہ ۔یا شمع کافوری پر منجمد بوند ۔

گلے میں ٹیپ ۔جیسے خوش نما بند پر ٹیپ کا مصرعہ جڑاؤ ہار گلے کا ہار ۔

غرضکہ گھر اندر کا اکھاڑہ بنا تھا اور پریاں ایلی گیلی پھر رہی تھیں ۔ہم صبح سے کوٹھے پر پہنچ گئے اور سب کی نظروں سے چھپے کواڑوں کی جھریوں میں سے آنکھیں سینکتے رہے ———— یوں تو جس پر نظر پڑتی جم کر رہ جاتی اور زبان حال سے کہتی ؎

بسان شکل تو بت کمتر آفرید خدا
ترا کشیدہ دو دست از قلم کشید خدا

لیکن ایک پری چھم برق دم آفت کا پرکالہ بجلیاں گراتی پھر رہی تھی ۔ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتیں ۔ہوش و حواس جواب دے رہے تھے ۔مکھڑے کی چمک آنکھ جمنے نہ دیتی اور چشم دیدار طلب کی خواہش کہ آنکھوں میں بٹھا لے ۔

سر سے پا تک حُسن کی چلتی پھرتی ، بولتی چالتی تصویر بوٹا سا قد ۔گداز بدن ۔جادو بھری انکھڑیاں پھرے پھرے گھر میں پتلی سی پھر رہی تھی ۔

یہ نغمۂ بلبل سے نا آشنا ، باغ جناں کی کلی ، دامن رضواں کا گلِ سر سبد تھی ۔نالۂ قمری سے نا واقف صدر رشک سرو و شمشاد ، عاشق مہجور کے گلے کا طوق

اوتھیلو ۔ شیکسپیر کے ڈرامہ کا حبشی ہیرو ۔ Othello

ڈسڈمونا ۔اسی ڈرامہ کی ہیروئن اوتھیلو کی معشوقہ ۔ Desdimona

عیوق ۔ ایک ستارہ ہے جو کہکشاں کی دائیں جانب نمودار ہوتا ہے ۔

بنی تھی۔ اشکِ شبنم سے غیر متعارف شگوفہ کسی کو خون کے آنسو رلا رہا تھا۔

حُسنِ یوسف بلائیں لے رہا تھا۔ عشقِ زلیخا اِس ملکۂ حُسن کے دربار میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ شہزادیٔ سبا کا حُسنِ مذاق نقشِ سلیمانی لئے کھڑا تھا اور میرے منہ سے سراپا دیکھ کر بار بار نکل رہا ہے۔ ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

شادی کا گھر ہے اور گھر بھی نواب یوسف علی خاں کا جو محلہ بھر کیا شہر بھر میں من چلے خرّاچ مشہور ہیں۔ پھر پہلا کاج اور وہ بھی اکلوتے لڑکے کی شادی خانہ آبادی کا۔ دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے۔ پوترڑوں کے رئیس ہیں اور ابھی کھرچن باقی۔ دل بھر کے دل کے ارمان نکال رہے ہیں۔ خدا نے یہ دن دکھایا ہے جو کچھ کریں سو کم ہے۔ سامنے بھی ٹکر برابر کی ہے جمشید نگر کے رئیس ہیں۔ شاہی زمانہ کے تعلقہ دار جاگیروں پرگنوں کے مالک۔ لاکھوں کی آمدنی اور پھر ایسے ہی خرچ۔ علاقہ بھر میں ان کی بابت مشہور ہے کہ کسی کی تو انگلیوں میں چھید ہوتے ہیں۔[1] ان کی ہتھیلی میں ہے" پیسہ ٹکتا ہی نہیں۔ دل کے غنی ہیں ہاتھ کے حاتم۔ جو آتا ہے لٹاتے ہیں۔ ان کا یہ واقعہ بچّہ بچّہ کی زبان پر ہے کہ گورنر کی ٹی پارٹی میں چندہ کی فہرست گھومی۔ سارے تعلقہ دار جمع تھے اور ایک ہز ہائینس بھی حفظِ مراتب کے تحت کاغذ پہلے ہز ہائینس کے سامنے گیا۔ انہیں یہ بات ناگوار گذری، بعد میں کاغذ جو ان کے سامنے آیا تو ہز ہائینس نے ایک لاکھ چندہ لکھا تھا۔ اس ببر شیر نے دو سے ضرب دیدی اور آگے یہ الفاظ ایزاد کر دیئے۔

" تونگری بدل است نہ بہ مال"

بس یوں سمجھ لیجئے کہ جمشید نگر کے رئیس کی لڑکی کی شادی نہیں ہے۔ جشنِ جمشیدی ہے۔

ادھر بھی توڑوں کے منہ کھل گئے ہیں، اُدھر بھی دولت بہائی جا رہی ہے ——— ابھی برات جانے میں عرصہ ہے، پر مہمانداری مہینوں پہلے سے شروع ہو گئی۔ زنانہ میں چوبیس گھنٹہ ڈھولک پٹ رہی ہے۔ دور دور سے ڈومنیاں آئی ہیں۔ ایک چہل پہل، گھما گھمی، دن عید رات شب برات ہے۔ ہمارا بھی یہ دستور کہ صبح ہوئی اور کوٹھے پہ

---

[1] "کسی کی تو انگلیوں میں چھید ہوتے ہیں۔ اُن کی ہتھیلی میں ہے" کہتے ہیں کہ جب آدمی ہاتھ کھول کر انگلیاں ملائے تو اگر ان کے بیچ میں چھید رہ جائیں تو اس شخص کے پاس روپیہ ٹکتا نہیں۔

جا پہنچے۔ رات گئے بادلِ ناخواستہ اُترے۔ کروٹیں بدل بدل کر صبح کی اور پھر دیدار بازی اللہ راضی۔

پڑوس کا معاملہ۔ خاندانی تعلقات۔ دیرینہ مراسم کا خیال، مزید برآں نوشاہ میاں لاڈلے سے نہ صرف ہمسایہ کے تعلقات، بلکہ ساتھ کے پلے بڑھے۔ نہ اشارہ کر سکیں نہ کنایہ۔ جھری میں سے بھی ڈرتے ڈرتے جھانکیں۔ غرضیکہ ہم دل کے ہاتھوں مجبور، اور دل ٹھیرا دیوانہ۔

وہ چلتی پھرتی نظر آجائیں، جان میں جان آجائے ورنہ جان مضطر دل بے قرار۔ احباب سے ملنا جُلنا چُھٹ گیا۔ باہر کا آنا جانا ترک ــــــ دن تو کوٹھے پر گذرتا ہی تھا اب ہم رات کو بھی وہیں بسیرا لینے لگے۔

دل اُنگلی پکڑ کلائی پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ جب صرف دیدار بازی سے کل نہ آئی اور دل چاہا کہ نام پتہ تو معلوم کریں شاید خدا کوئی شکل نکالے بسائیں کے سو کھیل۔ تو ہم نے تدبیریں سوچنی شروع کیں ــــــ کسی ماما اصیل کو بلائیں اس کے ہاتھ پیغام سلام پہنچوائیں ہم اسی ادھیڑبن میں تھے کہ شام کو دولہا میاں، میاں لاڈلے کا پیغام آیا کہ صورت ہی نہیں دکھاتے۔ کیا کچھ ناراض ہو گئے ہیں۔ مایوں[1] بیٹھا ہوں گھر سے نکل نہیں سکتا۔ کیا تمہارے پیروں میں بھی مہندی لگی ہے۔ آج رات کو ضرور آنا۔ لکھنؤ سے مہ لقا آئی ہیں، ان کا مجرا ہے اور کھانا بھی ہمارے ہی ساتھ کھانا ــــــ یہاں یہ حال کہ نہ مجرا اچھا لگے، نہ طائفہ۔ سچ تو یوں ہے کہ اپنی جان تک بری لگنے لگی تھی ــــــ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی جان و دل کی طنابیں کھینچ رہا ہو ــــــ جب اس کبک رفتار کو انگنائی میں مصروف خرام دیکھتا۔ دل پہلو سے نکلا جاتا تھا۔ اور یہ طائر بسمل اس قفس آب و گل کو چھوڑ کر اس طاؤس حناں کے قدموں پر لوٹنا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا متاعِ جان اور سکون دل اس نے لوٹ لیا تھا۔

مغرب بعد لاڈلے میاں کا پھر تقاضہ آیا۔ کہ "اب تک آئے کیوں نہیں"۔ میں قہر درویش یہ کہتا ہوا اُٹھا۔ ــ[1]

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا۔

منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدلے۔ گو دل نہ چاہتا تھا مگر گیا وہاں عجب رنگ تھا۔ مہ لقا چاہنے والوں

[1] شادی سے قبل دولہا مایوں بٹھایا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر باہر نہیں نکلتا۔

میں ایسی گھری بیٹھی تھی جیسے چاند ہالہ میں۔ میرا حال خراب تھا۔ چہرہ پر کیسر کھل رہی تھی۔ لاڈلے میاں نے کہا بھئی کیا بات ہے، بہت ہی مضمحل ہو رہے ہو سب کی نگاہیں مجھ پر تھیں منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

اک مہ لقا کی چاہ میں حالت خراب ہے

سب ہنس دیئے۔ مہ لقا بھی مسکرائی۔ بولی "اسم گرامی؟" میں نے کہا "چکور" فرمایا "کوئی پر تیغ نہ کرے" میں نے جواب دیا۔ "بہتر ہے کبکِ دری کو کابک میں بند کر لو۔ کہیں پردہ دری نہ ہو جائے۔" کہنے لگی "ماشاء اللہ جناب بہت اونچے اڑ رہے ہیں" میں بولا "ہوں بھی تو طائرِ سدرہ نشین" جو لوگ مہ لقا کو گھیرے بیٹھے تھے اس نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "فی الحال تو یہ ہالہ سدِ راہ ہے۔ جناب کا سدرہ کہاں ہے؟" میں نے کہا "نہیں کہیں اور سدِ راہ کی فکر نہ کیجیے ہم بصد راہ پہنچ جائیں گے۔"

نہیں روزن جو قصرِ یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

وہ بولی۔ "یہ جناب کا حسن ظن ہے ورنہ روزن دیوار سے جھانکنے والے کو زن نہیں ملتی۔ رونا پڑتا ہے" میں نے کہا:۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ کھانا چن دیا گیا ہے اور ہم سب اٹھ کر اطاق الطعام میں چلے گئے۔

میں دولہا کے قریب صدر میں بیٹھا۔ اور مہ لقا ہمارے سامنے ——— کباب میری طرف سرکا کر بولی "کباب ملاحظہ فرمایئے" میں نے کہا "خود کباب سیخ ہوں" تھوڑی دیر بعد وہ ایک اور قاب آگے بڑھا کر بولی۔ "بریانی ملاحظہ فرمایئے" میں نے جواب دیا "دل بریاں رکھتا ہوں" ——— اچھا تو کچھ شیرینی سے شوق فرمایئے" میں نے کہا۔ ایک شیریں دہن کی یاد نے زندگی تلخ کر دی ہے ——— کہنے لگی۔ اچھا تو پھر پانی ہی پیجیئے" میں نے کہا "بلا نوش ہوں سیلِ اشک سے پیاس بجھاتا ہوں" ——— اسکے بعد ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا "مرغ ——— سے شوق فرمایئے" میں نے جواب دیا "مرغی کی خواہش نہیں ہے"

مہ لقا یہ فقرہ کہنے کو تو کہہ گئی لیکن پھر مہرِ سکوت برلب ہو بیٹھی، آنکھیں اظہارِ ندامت کر رہی تھیں۔

کھانا ختم ہوا اور محفل آراستہ

مہ لقا کے کیا کہنے۔ در و دیوار سے موسیقی برس رہی تھی۔ شعر و جو مست ہوئے جاتے تھے۔ کسی کامل فن نائک کی سکھائی ہوئی تھی۔ سُر کی ایسی سچی کہ جہاں ٹک گئی ٹک گئی۔ تال کی ایسی پکی کہ کیا مجال جو آدھا ماترا بھی اِدھر سے اُدھر ہو جائے اور پھر ظالم کو وہ چیزیں یاد کہ باید و شاید سونے پر سہاگا اسکی ادا کی گائکی بتانا ہر شعر کی کیا ہر بول کی تصویر بن جاتی سو سو طرح ادا کرکے دکھاتی۔ ناچتی بھی قیامت کا تھی۔ کولوں کی حرکت پر کہ زمین گردش میں آئے، گنبد فلک تھرائے۔ آنکھ پتلی سی پھرے۔ شفاف ماتھے کے نیچے بھوؤں کی حرکت گردش لیل و نہار کے مترادف ـــــ پاؤں متحرک، جیسے دو حسین فاختائیں مصروفِ خرامِ ناز، مُنہ کو آنچل سے چھپائے تو محفل کے منہ سے بیساختہ نکل جائے ؎

منہ کو آنچل سے چھپا کر جو وہ رقصاں ہوتا
شعلۂ طور چراغِ تہِ داماں ہوتا

گھونگروؤں کی آواز رم جھم، رم جھم مینہ برستا معلوم ہو۔ طبلہ کی کمک دل پہ جا کر بیٹھے۔ سارنگی سو رنگ سے زخمہ زن دل ـــــ غرضکہ بارہ بجے تک مہ لقا فردوس گوش اور جنت نگاہ بہم پہنچاتی رہی۔

اب دوسرا طائفہ کھڑا ہوا، اور مہ لقا زنانہ میں بھیجدی گئی۔ حالانکہ اس کے بعد رنگ جمنا مشکل تھا لیکن یہ بھی دلّی کی نامی گرامی ڈیرہ دار طوائف تھی پہلی ہی تان کچھ اس ٹھاٹھ سے لی کہ رنگ محفل بدل دیا سب ہمہ تن گوش ہو بیٹھے۔

میں کوئی دو بجے کے قریب اُٹھ آیا، نیند آنکھوں سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ تارے گنتا رہا۔ دماغ دل کا غلام تھا اپنے آقا کے روبرو نت نئے منصوبے پیش کرتا دلِ ناداں کو کھلونوں سے بہلا رہا تھا۔ ریت پر سُست بنیاد محل بنا رہا تھا۔ کبھی سوچتا ملازمہ کو بلاؤں پھر خیال آتا کہ پرانی نمک خوار ہیں، اس سے یہ احتیاط کہ گھر کی رہنے والی باہر جانے نہ پائے زندہ آئے اور جنازہ جائے۔ غیر عورت کا اندرونِ خانہ گذر نہیں۔

ہائے کس گھر میں مرا یہ دلِ دیوانہ پھنسا

آخرکار خیال آیا کہ مہ لقا کو گانٹھوں۔ وہ مجرا کرنے گھر میں جاتی ہی ہے۔ پتہ چلائے گی۔ رنڈی ذات پیسہ کی میت۔ میں رقم کا لالچ دوں گا۔ جس راہ چلاؤں گا چلے گی۔

صبح ہوتے ہی نائک نقیب کو بلایا۔ دریافت کیا

مہ لقا کہاں ٹکی ہے معلوم ہوا اپنی سہیلی مشتری کے
ہاں قیام ہے سویرے ہی سویرے بغیر اطلاع کے
جا پہنچنا اچھا نہ معلوم ہوا۔ رنڈی اپنے دل میں
کیا سمجھے کیا نہ سمجھے ——— دل کہے
ابھی چل۔ عقل کا مشورہ آہستہ خرام۔ آخر کار نائک
کے ہاتھ اطلاع کرائی کہ ہم دس بجے آئیں گے۔
جوں توں کرکے یہ وقت کاٹا۔ زیادہ دیر کوٹھے ہی پہ
رہا ——— موہوم امید وصل کے
ساتھ آتش شوق تیز تر ہو گئی۔ اس بت کو دیکھ
دیکھ کر اور خدا خدا کرکے دس بجائے اور ہم مشتری
کے کمرہ پہ جا براجے۔ مہ لقا انتظار کر رہی تھی۔
جانے کو تو چلے گئے، دل بے قرار ہے گیا۔ پہ
اب وہاں کوئی بات بنائے نہ بنی۔ لاکھ ہمت باندھتا
ہوں پہ زبان نہیں ہلتی ——— رسمی گفتگو
کے بعد ہم بھی چپ ہو بیٹھے اور وہ بھی لیکن وہ ٹھیری
طوائف۔ لگی ادھر ادھر کی باتیں کرنے۔ ہم بھی ہاں
میں ہاں ملاتے رہے ——— دلی اچھا
مقام ہے۔ مجھے پسند آیا۔"
"صاحب۔ اب کیا دھرا ہے۔ لٹ چکا۔"
پھر بھی سب کچھ ہے۔ ہاتھی لٹ کر بھی سوا
لاکھ ٹکے کا ہوتا ہے۔" آپ کیا فرماتی ہیں۔ کھنڈر دلی
کی دنیا ہے۔ عمارتوں کے بھی کھنڈر رہ گئے ہیں پرانے
خاندانوں کے بھی۔"
غرضکہ ایسی ہی بے سُری باتیں ہوتی رہیں۔ ہمارا
دل و دماغ کہیں اور تھا۔ وہ بھی ایک نظر باز عورت
تھی۔ تاڑ گئی۔ کئی مرتبہ خاموش ہوئی کہ مجھے جو کچھ
کہنا ہو وہ شروع کروں۔ پر کیا کرتا زبان نے ساتھ نہ
دیا۔ حرفِ مدعا لب تک آ آ کر رہ گیا ———
شریف لڑکی کا ذکر طوائف کے سامنے اور پھر اظہارِ
عشق کے ساتھ شرافت مانع آتی تھی۔ زبان رُکی
جاتی تھی۔ دل کچھ کہے دے رہا تھا۔ عجب کشمکش کا
عالم تھا کہ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

اس نے جواب دیا۔

رُکا رُکا خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

"جو دل چاہتا ہے کہہ ڈالئے۔ اسے مارنا اچھا نہیں
بہت نازک ہوتا ہے ذرا سے میں کملا کر رہ جاتا ہے۔"
میں نے کہا۔ ع کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا۔
وہ فوراً بولی۔ ع بن کہے بھی رہا نہیں جاتا۔
میں نے بمشکل زبان کھولی اور اتنا منہ سے نکالا:-

"اک مہ لقا پہ مرتا ہوں"

بولی "یہ تو صورت بتا رہی ہے۔ آہ سرد دلِ پُردرد رنگِ رُخ زرد۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ کون سا چاند ہے جس کے آپ چکور ہیں۔" کہنے کو تو اتنا کہہ گیا پر آگے زبان رک گئی۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی ناموس کا معاملہ، عزت کے سودے۔ دل سودا زدہ کہہ دینے پر مجبور کرے۔ ناصح عقل زبان ہلانے کی اجازت نہ دے۔

میری یہ حالت دیکھ کر وہ بولی "ایسی کونسی شیریں ہے جس نے آپ جیسے چہچہاتے ہوئے فرہاد کے لب بند کر دیئے"

میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا :- ؎

سینہ میں دل ہے دل میں داغ داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں، پردہ نشیں کا رازِ عشق

بولی :- اچھا تو یوں کہئے۔ خیر سے کسی پردہ نشین پر دل آیا ہے۔ جب ہی تو کل دیوار آہن پر یہ زن کئے جا رہے تھے۔ بندہ پرور یہ لوہے کے چنے ہیں ؎

کوہکن کو حکم جوئے شیر ہے
عشق بازی سخت ٹیڑھی کھیر ہے

میں نے کہا "جانتا ہوں پر کیا کروں دلِ دیوانہ نہیں مانتا۔ للہ کوئی تدبیر بتایئے۔ جواب ملا "دِل بہلانے کی؟" .... میرے منہ سے نکل گیا۔ ع

دلِ ہیتاب بہلتا نہیں بہلانے سے

فرمایا "میں اب سمجھی جناب کو ان تک رسائی کی تدبیریں اس ناچیز کا مشورہ درکار ہے۔ سچ ہے یہ فن رنڈی سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ آپ ماشاء اللہ ٹھیرے اپنے عشق کی گھاتوں کو محبت کی باتوں کو کیا جانیں۔ کسی نے آپ ہی جیسوں کی بابت کہا ہے۔ ع "ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں"

میں نے کہا۔ آپ تو خفا ہو گئیں۔ غرض دیوانی ہوتی ہے۔ اور اس وقت ہم پر بری بنی ہے للہ ترس کھایئے" فرمایا "اچھا تو میرے مشورہ کی فیس؟ میں نے کہا "جان تک حاضر ہے"

کہنے لگی۔ آپ کی جان آپ کو مبارک، میں دل و جان سے حاضر ہوں" ———— تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی دیکھئے صاحب اگر گھر کے قریب رہتی ہیں تو گُڈّی پہ عاشقانہ شعر لکھ کر گرایئے۔ جب ذرا اپینگ بڑھ جائیں تو حرفِ مُدّعا ملٹ پر لکھ کر دکھایئے۔ پھر آبگینہ کو آئینہ سکندری بنایئے۔ جب وہ شیشہ میں اُتر آئیں تو گلے سے لگایئے۔ گھر کی ماما کو ملایئے۔ پیغام سلام کروایئے۔ اظہارِ مُدّعا کیجئے جب اُدھر سے انکار ہو تو جوگی کا بَرن لیجئے ان تک یہ خبر

پہنچوائیے کہ جنگل بیابانوں میں دیوانہ وار پھر رہے ہیں

آہوانِ صحرا ہیں اور یہ صحرا نشین۔ ع

تیرا ہی نام لب پہ ہے نامِ خدا کے بعد

اگر یہ داؤں بھی نہ چلے اور وہ شمع رو نہ پسیجے تو

پھر یہ افواہ گرم کرائیے کہ چار روز ہوئے تولہ بھر افیون کھالی۔ وہ تو خدا نے جان بچالی۔ اتفاق سے ایک دوست نے بازار میں خریدتے دیکھ لیا وہ بھی سایہ کی طرح ساتھ ہولیا۔ شہر کے باہر جا کنوئیں میں سے ڈول کھینچ گولی منہ میں ڈال اوک سے پانی چڑھا گئے یار نے دلدار کی قسمیں دلا کر قے کرائی، شہر لے کر آیا ڈاکٹر حکیم ہو رہے ہیں وہ تو یہ خیر ہوئی کہ پولیس کو خبر نہ لگی۔ نہیں تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ آپ کا نام بھی کوتوالی چبوترے پر لیا جاتا۔ آبرو خاک میں مل جاتی۔ یہ وار کبھی خالی نہیں گیا۔ بس یوں سمجھئے پھر تو۔ ع

کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے

——— پھر کیا ہے یاروں کے گھرے ہی گھرے ہیں۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے ———

باغ میں اس نونہال چمن حسن کو بلائیے محفل سجائیے پھر کچھ حصہ بہارِ عشق کا اور کچھ زہرِ عشق کا ادا فرمائیے۔" اس کا کچھ دار بیان اور پھر وصل کی داستان

میں محو ہو گیا اور نہ سمجھ سکا کہ میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے جب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی دیکھی تو احساس ہوا اور یہ مصرعہ پڑھتا ہوا اٹھا۔ ع

دیدہ و دل پہ مرے زخمِ جگر ہنستے ہیں

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور کہا۔ ع

ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں ———

اور پھر کہنے لگی اس پہیلی کی جو تھوڑی بہت بوجھ میں سمجھ سکی ہوں اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی شریف گھر کی لڑکی پر دل ٹوٹ کر آیا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں پھر یہ شعر پڑھ دیا ؎

سینہ میں دل ہے دل میں داغ داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

یہ سُنکر وہ کچھ غوطہ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ یہ عزت کے سودے ہیں۔ ناموس کے معاملے دل لگی نہیں ہماری مانئے تو ادھر سے خیال ہٹا لیجئے۔ عالم رنگ و بو میں دل بہلائیے۔ یہ رنگ تو نبھ سکتا ہے اور وہ خیال برا رنگ لائے گا۔ مانا کہ میں آپ کے خیال میں عمر سے اتر چکی ہوں۔ جس کی طرف جناب نے اس ناچیز کو مشاطہ کا کام سپرد فرما کر نہایت لطیف پیرایہ میں اشارہ بھی فرمایا ہے۔

سچ ہے۔ ؎

تجبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلّالی ——

تاہم میری سہیلی آپ کے شہر کی رہنے والی مشتری بائی جناب کے حلقہ سے باہر نہیں ہو سکتی۔" میں نے احتجاج کیا اور کہا خدا کی قسم یہ مُراد نہ تھی۔ اس نے جواب دیا۔" میں جانتی ہوں یہ تو محض بطور مذاق عرض کیا تھا۔ بہرکیف میری صلاح یہی ہے کہ اس خیال سے باز آئیے اور کسی حُسن فروش سے دل لگائیے میرا ذمّہ خیال بٹ جائیگا۔ اس لونڈی کا جو تھوڑا بہت مردوں کا تجربہ ہے اس کی بنا پر عرض کر رہی ہے ان کا دل انجن کی طرح آتا ہے لیکن ذرا بھی لائن بدل دی جائے تو پھر پُرانی پٹڑی کو ایسا بھول جاتا ہے جیسے ؎

اِن تلوں تیل ہی نہ تھا گویا
ہم سے کچھ میل ہی نہ تھا گویا

میں نے کہا۔ بیگم" یہ وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اتار دے"

—— جواب مِلا۔" میں ایسی نادان نہیں جو ترشی پیش کروں۔ ہم لوگوں کا کام نشہ اتارنا نہیں گھٹوانا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کسی شکر لب شیریں دہن کے ساغرِ چشم سے ساز باز کیجیے۔ شرابِ وصل لنڈھائیے۔" میں نے یہ شعر پڑھ دیا ؎

لبت شکر بمستاں داد و چشمت مے بہ میخواراں
منم کز غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم

آخرکار وہ مایوس ہو کر بولی۔ آپ نہیں مانیں گے اچھا تو پھر فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتی ہوں۔

کچھ ہچکیاں لے لے کر ہم نے بیان کیا۔ کچھ کُرید کُرید کر اس نے پوچھا۔ غرض یہ مُدّعا ادا ہو گیا کہ وہ گھر میں جاتی ہیں۔ اتا پتا ہم بتائیں۔ نام پتہ وہ معلوم کر کے آئیں تاکہ کوشش کی جا سکے ——

تھوڑی دیر تو وہ سوچتی رہی۔ اس کے بعد بولی شریفوں رئیسوں میں اس لونڈی کا مُنہ کالا کروائیے گا آپ کو معلوم ہے۔ اکثر و بیشتر گھرانوں میں ہمسکو اندرون خانہ پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ انتہا یہ ہے کہ رنڈی یا طوائف کا لفظ بھی بہو بیٹیوں کے منہ سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کوٹھے والی کی ہوا سے انہیں بچاتے ہیں۔ اس احتیاط میں جہاں اور مصلحتیں پنہاں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم باہر کی بات گھر تک پہنچا سکتے ہیں۔ گھر کی باہر لیجا سکتے ہیں اور میری بہنوں نے ایسا یقیناً کیا ہو گا۔ انہیں گنوں سے اس دہاڑے کو پہنچے کہ کسی کو ہمارا اعتبار نہیں رہا۔ اب اگر کوئی گھرانا ہماری یہ عزّت افزائی کرتا ہے کہ محلات تک ہم کو جانے دیتا ہے تو اس کا اسے یہ پھل دیں کہ اندرون خانہ عاشقانہ پیام سلام

پہنچا ہیں۔ کنواری بچیوں کے نام نشان عیاش طبع
نوجوانوں کو آکر بتائیں۔ معاف کیجئے۔ بندی سے
ایسا نہیں ہو سکتا ——— ان الفاظ
سے ایک چوٹ سی لگی اور ایسا معلوم ہوا، جیسے
رگِ جاں پر کسی نے نشتر لگایا ہو۔ میں نے احتجاج
کرنا چاہا۔ لیکن رنڈی نے بات سچی کہی تھی، زبان گل
گئی، الفاظ ہونٹوں تک آنہ سکے ——— وہ
مسلسل کہتی رہی "۔ کیا عرض کروں۔ میں اس خدمت
سے معذور ہوں۔ دست بستہ اتنا اور عرض کرنا چاہتی
ہوں کہ اگر اپنی ناموس عزیز ہے تو پرائی پر نظر نہ
ڈالیئے۔ میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہی ہوں ———
عزت اور عصمت کی دولت سے کبھی میں بھی مالامال
تھی۔ اس نعمت کی قدر اس کے زوال کے بعد ہوئی
اور اس شخص کا بھی انجام مجھے معلوم ہے جس نے میری
چادرِ عصمت اُتار مجھے ننگا بازار میں کھڑا کر دیا۔"
کچھ ان باتوں نے ایسا شرمندہ کیا کہ وہاں
ٹِک نہ سکا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ مہ لقا سمجھی، کہ میں
ناراض ہو گیا۔ وہ اصرار کرکے روکتی رہی لیکن
قلب پر کچھ عجب کیفیت تھی اور اس کا پوری طرح
اطمینان کئے بغیر چلا آیا۔ پہلے تو نیچے ہی کمرہ میں
منہ لپیٹے پڑا رہا۔ جب دل نہ مانا تو مجبوری کوٹھے پر چڑھا۔
لیکن آج پاؤں کچھ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ اوپر جا کر بھی
ان کواڑوں سے دور ہو بیٹھا۔ جن کے قریب جانا
چاہتا تھا ——— مقاومت کرنے والی
مچھلی کو شکاری ڈھیل دے دے کر کھینچتا ہے۔
مجھے بھی جذبۂ بے اختیار بتدریج اُن جھریوں تک لے
ہی گیا جن میں سے ان کا جمالِ جہاں آرا نظر آتا تھا۔
لیکن آج تارِ نگاہ ٹوٹ ٹوٹ کر واپس آجاتا میرے
قدموں میں خوشامدانہ انداز سے لوٹتا اور جانے سے
انکار کرتا معلوم ہوتا تھا ———
چند روزہ دیدار کا سہارا تھا اُس کا بھی مزا آدھا
رہ گیا۔ میں افسردہ خاطر اٹھا اور گلی کی جانب ایک
کھڑکی کی چوکھٹ سے لگ، آتے جاتوں کا تماشا
دیکھنے لگا۔ سامنے سے میرے ہاں کی حیدرآبادی ماما
آبنوس کا کندہ لیکن آنکھ ناک سے اچھی آتی نظر آئی
اس کے پیچھے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کے مردِ معقول مجنوں
صفت چلے آرہے تھے۔ اس رشکِ لیلیٰ نے پلٹ کر
ان سے کچھ کہا۔ وہ پیچھے ٹھٹک گئے اور دیوار کا سہارا
لے کر کھڑے ہو گئے۔ جب کوئی ادھر سے گذرتا تو یہ
صاحب ٹہلنے لگتے اور پھر اپنا مورچہ سنبھال لیتے۔
——— میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ
گئی غضب خدا کا میرے گھر کی ماما پر کوئی بُری نظر

ڈالے۔ دو نوکروں کو بھیج شریفوں کی گلی میں بلا وجہ مشتبہ انداز سے کھڑے رہنے کے جرم میں ان کی کندی کروائی ماما کی بابت یہ حکم نافذ کر دیا گیا کہ آج ہی ایک نوکر اسے حیدرآباد کی ٹرین میں سوار کروا آئے۔ ہمارے ہاں ایسی کا کام نہیں۔

جب غصہ اترا تو مہ لقا کے یہ الفاظ کانوں میں گونجنے لگے کہ اپنی عزت عزیز ہے تو دوسروں کی عزت پر نظر نہ ڈالو" یہ آواز بلا ارادہ دماغ کے گنبد سے ٹکرا ٹکرا آ رہی تھی۔ مجھ پر قیامت بیت رہی تھی وہاں تو ہر عضو بدن ہمارے خلاف گواہی دے گا یہاں ہر بن موز بان شعلہ بنا مجھے جھلس رہا تھا اور یہی کہتا تھا کہ تیرے گھر کی ماما کو کوئی دیکھے تو تو آگ بگولہ ہو جائے اور تو دن دن بھر شریفوں کی بہو بیٹیوں کو گھورے۔

جو کواڑ مجھے مقناطیس کی طرح گھسیٹتے تھے اب برے لگنے لگے۔ جن جھریوں پر میری آنکھیں جمائے بیٹھا رہتا تھا وہ اب دور سے آنکھیں کھانے لگیں۔ میں پژمردہ ہو کر نیچے اتر آیا اور مردہ کی طرح پلنگ پر پڑ گیا ——— مغرب کے بعد لاڈلے میاں کا آدمی آیا پرچہ لایا۔ لکھا تھا مہ لقا یاد کرتی ہیں نہ جاتا تو برا مانتے شکایت ہوتی لکھ بھیجا ابھی آتا ہوں۔

جب میں پہنچا تو بزم جمی تھی۔ قہقہہ چہچہے ہو رہے تھے میری آنکھیں سرخ تھیں، دل کے شعلے ان آئینوں میں جھلک رہے تھے ایک نے کہا ؎

سرخ ڈورے تری آنکھوں کے پتہ دیتے ہیں
رام رنگی میں بسر کی ہے کہیں آپ نے رات

دوسرا بولا ؎

تو بہ شب نہ رخ نمودی بہ برے کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

مہ لقا کچھ نہ بولی، میری طرف اک نگاہ ڈالی اور آنکھیں جھکا لیں۔ دسترخوان بچھا۔ میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ مہ لقا اور لاڈلے میاں نے اصرار کر کے بٹھا لیا۔ زبردستی مجھے کھلاتے رہے۔ اب گانا شروع ہوا۔ محفل بے تکلف تھی مہ لقا صدر میں ہمارے پاس بیٹھی رہی۔ کنور پتلی نے یہ غزل شروع کی ؎

عشق کی رنگیں ادائیں یاد کرتی ہیں تمہیں
عہد ماضی کی خطائیں یاد کرتی ہیں تمہیں
جو زمیں پہ گر رہے ہیں آسماں سے ٹوٹ کر
ان ستاروں کی ضیائیں یاد کرتی ہیں تمہیں
مہ وشوں کی تو جبیں کے در پہ کرتی ہے سجود
کالی کالی وہ گھٹائیں یاد کرتی ہیں تمہیں

روتے روتے جو در مقصد پہ آخر سوگئیں۔
غمکدہ کی وہ دُعائیں یاد کرتی ہیں تمہیں
سسکیاں بھر کر جو روتی ہیں نہ جانے کس لئے
وہ فسردہ التجائیں یاد کرتی ہیں تمہیں
جو سکونِ زندگی کو کہہ چکا ہے الوداع
ایسے مضطر کی دُعائیں یاد کرتی ہیں تمہیں

میری حالت خراب، غزل نے دل کی دنیا تہ و بالا کر دی، انگارے حلق کے نیچے اتاروں تو آنسو امڈے چلے آئیں۔ یارائے ضبط نہیں۔ رونے کا موقع نہیں۔ آہِ آتش بار نکلنے کو بے قرار۔ دل جھلسائے دے کلیجہ منہ کو آئے۔ مہ لقا پریشان ہو ہو کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ خدا خدا کرکے غزل ختم ہوئی اور مہ لقا نے مجھ سے کہا لیجئے صاحب اب وہ غزل مجھے لکھوا دیجئے۔ جس کا آپ نے کل وعدہ کیا تھا۔ میں پریشان کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ میں خموش ہوا وہ بولی یہ نہیں ہوگی۔ غزل میری ہو چکی اور میں آج ہی گا دوں گی۔ دیکھئے نواب صاحب یہ وعدہ کرکے پھر رہے ہیں۔ قول مرداں جان دارد۔ اور پھر لاجواب غزل ہے۔ محفل پھڑک اٹھے گی آپ داد فرمائیے۔ مجھے جلدی اس لئے ہے کہ ابھی دھن بھی بٹھانی ہوگی۔ ساتھ کے ساتھ مجھے آنکھ سے اشارہ کیا، میں سمجھا تو خاک نہیں، ہاں میں ہاں ملا کر ساتھ ہولیا۔ کاغذ قلم دوات کے لئے نوکر سے کہہ دوسرے کمرہ میں چلا گیا ——— وہاں پہنچتے ہی کہنے لگی۔ آپ مجھ سے خفا ہیں۔ میں تو سارے دن پریشان رہی۔ معاف کیجئے گا۔ میں آپ کو محفل میں سے اٹھا لائی۔ اس ظالم نے چیز ہی ایسی شروع کی تھی کہ انہوئے کا دل بھر آئے اور پھر آپ تو چوٹ کھائے ہوئے ہیں لیکن حضور ع

"قابو میں جگر رکھنے ہیں قبضہ میں نگاہیں"

مجھے ڈر تھا کہ اگر ایک اور چیز اس نے ایسی ہی شروع کر دی تو کہیں رازِ دل ساغرِ چشم سے چھلک نہ جائے اور کنور بیتلی کو ہے آج کل لگی ہوئی۔ وہ بھی ٹھنکی بیٹھی ہے۔ کم بخت چوبیس گھنٹہ ایسی ہی چیزیں گاتی رہتی ہے۔ دل کا سوز آواز میں آگیا ہے تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ اس وقت مجھے دل سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ آپ کی تو بات ہی دوسری ہے۔

اتنے میں نوکر کاغذ قلم دوات لے آیا اور اس نے پانی کے دو گلاس منگائے پھر کہنے لگی کل کسی وقت یا تو اس ناچیز کو بلائیے یا خود تکلیف فرمائیے۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ میں آپ کو اتنا ڈوبا ہوا نہیں سمجھتی تھی، بہت اچھا اب کل باتیں

ہوں گی۔ میں کس وقت انتظار کروں۔ میں نے کہا دس بجے صبح پہنچ جاؤں گا۔ لیکن غزل تو آپ نے لکھی ہی نہیں۔ بولی میں ابھی یاد سے لکھے لیتی ہوں۔ آپ کی دُعا سے سینکڑوں یاد ہیں۔ میں نے کہا یہ بات غلط ہے اس وقت تو میری ہی بتائی ہوئی گانی پڑے گی۔ بولی جو حکم۔ مگر اک شرط کے ساتھ۔ میں نے پوچھا کیا۔ بولی اب للّٰہ طبیعت کو قابو میں رکھیئے گا۔ میں نے اس کو یہ غزل لکھوا دی ؎

کام کیا معلوم کس کی بات آجائے کہاں
کیا خبر کب گردشِ آفات آجائے کہاں

اس نظر سے بھی تو آغازِ سفر کوئی کرے
شام ہو جائے کہاں یا رات آجائے کہاں

آسماں کے جَور کا بھی ذکر ہم کرتے نہیں
کیا خبر چل کر کہاں سے بات آجائے کہاں

دیدہ و دل سے کوئی غفلت نہ ہو جائے کہیں
یعنی کب وہ جانِ محسوسات آجائے کہاں

مے پرستوں کے لئے حیرت کسے معلوم ہے
پھر کوئی ایسی ہی اک برسات آجائے کہاں

اُس نے اُستادوں کو بُلا، دھن قائم کرلی شروع کی۔ میں پھر محفل میں آ بیٹھا۔ لوگ کچھ مشتبہ ضرور تھے لیکن میرے فوراً چلے آنے اور اُستادوں کے بُلانے جانے پر شکوک رفع ہو گئے۔

ایک بجے کا عمل تھا جو میں گھر پہنچا۔

صبح دس بجے حسبِ وعدہ مشتری کے ہاں جا پہنچا۔ سراپا انتظار بنی ہوئی تھی۔ بولی "گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے"۔ کل آپکی حالت دیکھ کر میرے زخم ہرے ہو گئے۔ بیتی ہوئی داستانیں گذرے ہوئے افسانے یاد آ گئے۔ سوچا کہ کچھ دیر باتیں ہی کریں گے۔

پہلے میری لکھوائی ہوئی غزل کا ذکر آیا۔ اور پھر شعر شاعری ہونے لگی، حتّٰی کہ بیت بازی چھڑ گئی۔ اس کا ایک شعر کاف پہ ٹوٹا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ؎

کافی ہے تیرا نام بھی تسکینِ قلب کو
گر تو نہ بزم میں ہو تری گفتگو سہی

وہ مُسکرا کر بولی۔ ؎

یار کا ذکر کئے جاتا ہوں
وصل کی فکر کئے جاتا ہوں

میں نے کہا۔ ؎

ناوک انداز کے تیروں کی قسم
دل میں ایک زخم لئے جاتا ہوں

بولی۔ ؎

نام لینے میں کیا بُرائی ہے
دل کی تسکین کی ایک صورت ہے

میں نے کہا۔ ؎

یاد مجھ کو تری نصیحت ہے
اس لئے میں خموش بیٹھا ہوں

جواب ملا۔ ؎

ناصحا خود بھی زخم خوردہ ہے
بے تکلف سُنائیے صاحب

اور پھر کہنے لگی۔ بندہ نواز۔ کل آپ کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ ع

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

یہ لونڈی جب تک یہاں ہے۔ کم از کم اتنا ہی فرض انجام دے گی کہ ان کی باتیں آپ سے کیا کرے ——— باتوں باتوں میں نوبت بہ اینجا رسید کہ ہم نے ماما کا سارا قصہ کہہ سنایا اس نے کہا حضور بندی نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کہ چاہ کن را چاہ در پیش۔ شکر کیجئے کہ ماما ہی پر ٹلی۔ شریف آسانی سے سبق لے لیتے ہیں۔ نیز شفیق معلم قدرت بھی اتنی ہی تادیب کرتا ہے جتنی ضروری سمجھتا ہے۔ پھر بر سبیل تذکرہ نہایت خوبصورتی سے مجھ سے دریافت کر لیا کہ شادی ابھی نہیں ہوئی۔ ارشاد ہوا تو پھر دیر کیوں نہیں کر لیتے۔ میں نے کہا مجھ سے یہ جنجال بھگتا نہیں جائیگا۔ بولی تو پھر تیر تکوں ہی پر گذر کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کی خوشی۔ ہاں اتنا میں عرض کرتی ہوں کہ بہو بیٹیوں پر خدارا کرم رکھئے گا۔ یہ نگہہ کرم شاہدانِ بازاری تک رہے تو بہتر ——— حالانکہ شریف کے لئے تو اس میں بھی خرابیاں ہیں۔ میں نے کہا "نہ خدا تو دے نہ میں دوں" بہو بیٹیوں پر نظر نہ ڈالو۔ حُسن فروشوں میں دن گذارو، اور خرابیاں وہاں بھی موجود۔ حضرتِ ناصح اگر لگے ہاتھوں ان سے بھی آگاہ فرما دیں تو انسب ہے" ——— بولی میں آپ کو کیا بتاؤں۔ ابھی چند روز کی بات ہے ہمارے لکھنؤ میں ایک شریف زادہ کا تعلق طوائف سے تھا۔ ہونی شدنی بات اسے حمل قرار پا گیا۔ ان کے تلوؤں سے لگ گئی کہ یہ کیا ہوا۔ تھے خاندانی آبرو کا پاس۔ عزت کا خیال، ایسے گھر میں اپنی اولاد ہونی کون گوارہ کر سکتا ہے۔ لڑکا ہو تو بُرا اور لڑکی کا تو پھر کہنا ہی کیا۔ دل میں ٹھان لی کہ اسقاط کرائینگے رنڈی کے ماں باپ نے بڑے ہیر پھیلائے۔ آخر چار ہزار روپیہ لے کر راضی ہوئے۔ ڈاکٹرنی نے بھی خاصی بڑی رقم چیری۔ وقت کی خوبی رنڈی اوپریشن

میں مرگئی۔ پولیس تھانہ ہوا۔ نک کٹائی جگ ہنسائی ہوئی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ جب کہیں خدا خدا کرکے عزت بچی سو میاں حرام تو پھر حرام ہی ہے رنگ لائے پہ لائے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ لاڈلے میاں کے ہاں سے نوکر آیا، پیغام لایا کہ دن کا کھانا وہیں کھانا اور ذرا جلد ہی آنا۔ میں اجازت لے کر اٹھ آیا۔ اس مسئلہ پر غور کرتا رہا۔ آخر دوسرے دن جا ہم نے مہ لقا سے کہہ دیا کہ جو اس کام میں تم ہماری مدد کرو تو ہم انہی سے شادی کرلیں گے بولی شریف کا وعدہ ہے میں نے صرف گردن ہلا دی۔

کہنے لگی اچھا تو آج میں محلسرا میں جاؤں گی ان کے جوڑے کا رنگ مجھے بتا دیجئے۔ میں نے کہا معلوم نہیں فرمایا کیا روزن دیوار مسدود ہو گئے۔ میں نے جواب دیا ہم نے دیکھنا بند کر دیا۔ کہنے لگی، یہ آخر کیوں۔ میں نے بہت آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا "اگر اپنی ماں بہن کی عزت پیاری ہے تو دوسروں کی ماں بہن کی عزت پر نظر نہ ڈالو" ______

اس نے مجھے سر سے پاتک دیکھ کر کہا "خدا کا شکر ہے۔ سچ ہے شریف انسان کو ایک بات کافی ہوتی ہے اچھا تو اب جناب نے شرعی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو انہیں دیکھ لیجئے گا اور مجھے محفل میں کسی عنوان سے بتا دیجئے گا۔ آپ کو زبان پر قدرت ہے۔ اور میں بھی نا فہم نہیں۔ میں نے کہا اس پر تو میری بھی صاد ہے۔ شام کو مغرب سے قبل ان کے جوڑے کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ شادی کے ارادہ کے بعد سے ان کی جانب میرے جذبات کا عنوان بدل گیا تھا۔ دل وہی تھا۔ مگر تعلق خاطر کچھ اور آنکھیں وہی تھیں۔ دیکھن بدل گئی تھی۔

ان بیگم نے سر سے پاتک کاسنی جوڑا زیب بر کر رکھا تھا۔ آج میں بن بلائے لاڈلے میاں کے ہاں جا دھمکا۔ انہوں نے کہا۔ زہے نصیب آج تو حضور خود تشریف لے آئے۔ مہ لقا دوپہر سے وہیں تھی۔ بولی مزاج تو اچھا ہے۔ میں نے کہا آج کچھ دل پر گرمی سی محسوس ہو رہی تھی، ابھی زلال کاسنی پیکر آرہا ہوں سر سے پاتک ٹھنڈک آ گئی وہ اس طرح مسکرائی جس کے معنی تھے کہ میں سمجھ گئی۔ بس کافی ہے! اول شب اس نے مردانہ میں مجرا کیا۔ بارہ کے بعد حویلی میں گئی۔ دوسرے دن تکلف برطرف ہم صبح ہی جا براجے۔ وہ منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔

بولی اللہ رے شتابی۔ تشریف رکھئے میں ابھی حاضر ہوئی۔ اتنا خیال رہے "جڑاؤ کپڑے پہنوں گی"

میں نے کہا "جو انکار کرے سو کافر"۔
معلوم ہوا کہ لاڈلے میاں کی خالہ زاد بہن ہیں لال کنویں پر مکان ہے۔ میں نے کہا بس اب میں سمجھ گیا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ کچھ شکل تو نکلی پتہ تو معلوم ہوا۔ آگے خدا مسبب الاسباب ہے۔

——— میں نے گھر آ اپنی ماموں زاد بہن کو بلا بھیجا۔ ان سے قدرے بے تکلفی تھی۔ اُن ہمیشہ شادی کا شدید تقاضہ کرتی تھیں۔ اب کے بھی انہوں نے آتے ہی خانگی[1] دہرائی اے شادی کر لو نا۔ ایسی بھی کونسی گھڑی ہوئی منہ سے "نہیں" نکل گئی کہ اب کسی طرح ہامی بھرتے ہی نہیں۔ اللہ جانے سُونا سُونا گھر بُرا لگتا ہے۔ میں کہتی ہوں پھپی اماں کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ چاند سی بہو بیاہ کر لائیں۔ گھر میں چھم چھم کرتی پھرے۔ پوتا پوتی کھلائیں۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اماں نے کہا بیٹی کیا کہوں، میری تو دُعائیں مانگتے مانگتے نگوڑی زبان بھی سُوکھ گئی، یہ میاں راضی ہی نہیں ہوتے جو ان کا ایک آدھ بھائی اور ہوتا تو بھی میں صبر کر لیتی اب تو اللہ رکھے خاندان کا نام انہی کے دم سے چلنا ہے۔ پر ماں بندی کیا کرے۔ یہ راضی کئی ہوں تم جانو لڑکی تو ہیں نہیں جو زبردستی باندھ دوں۔

اماں کا سہارا ملتے ہی وہ مجھ پر چھا گئی۔ ادھر ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ والدہ دوسرے کمرہ میں نماز پڑھنے چلی گئیں اور ادھر اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لے ڈالا اللہ نہ کرے جو ایسی ناکہن اولاد ہو۔ سچ کہتی ہوں جو میرا شمس الدین ایسا سرخود (خودسر) ہوا تو کان پکڑ کر گھر سے باہر کر دوں گی۔ میں کہتی ہوں۔ ایسی بھی کیا ضد۔ لو اب تو کانوں سے سُن لیا کہ پھپی اماں دن رات دعائیں مانگتی ہیں۔ میرے مولا اس گھڑی ان کی سُن لے۔ آخرکار نانکر کے بعد ہم بھی نیم راضی ہو گئے۔ اور باتوں باتوں میں یہ آواز بھی کان میں ڈال دی کہ لاڈلے میاں کی خالہ زاد بہن سے کرا دو تو ہم راضی ہیں۔ وہ بولی۔ اے یہ کونسی بڑی بات ہے۔ اللہ جانے اس وقت سارے شہر میں چراغ لے کر ڈھونڈو تو میرے بھائی سا لڑکا نہیں جڑے گا اللہ نے چاہا تو کہنے کی دیر ہے۔ راضی ہونے کی دیر نہیں ——— اور لڑکی بھی اللہ جانے تمہارے قابل ہی ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں ایک۔ اس وقت شہر بھر میں جواب نہیں۔ ٹھوڑی تارا۔ ماتھے چاند، اندھیرے میں بیٹھ جائے تو اُجالا ہو جائے۔ ہاں ایک بات بتا دوں۔ یہ تمہارا

[1] خواندگی۔

خیال وہاں کیونکر پہنچا۔ میں نے کہا۔ آپ لاڈلے میاں سے اپنی دانت کاٹی روٹی ہے۔ جانے بوجھوں میں رشتہ ہو تو نباہ اچھی ہوتی ہے۔ بس اتنی بات ہے اور کچھ نہیں۔ اس نے ٹیڑھی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر چپ ہوگئی۔ غرضکہ میرے منہ سے ہاں نکلنی تھی کہ سارا کنبہ دوڑ پڑا۔ بات پکی ہوگئی۔ جانبین سے تیاریاں ہونے لگیں دن رات دھما چوکڑی مچی رہتی۔ تین مہینہ بعد بیاہ رچا محفلیں ہوئیں دور دور سے طائفے بُلائے گئے۔ مہ لقا کو پل پل کی خبر دی جا رہی تھی۔ بھلا وہ کیونکر نہ آتیں میں نے ہیرے کے جڑاؤ کڑے اپنے ہاتھ سے پہنائے پر اللہ رے تیری آن، جاتے ہوئے ریل سے ہاتھ نکالکر ایک ڈبیہ مجھے دے دی۔ اب جو کھولکر دیکھتا ہوں تو کوئی چار رتی کا گلابی ہیرا انگوٹھی میں دمک رہا ہے۔ ساتھ ایک پرچہ بھی تھا۔ لکھا تھا خدا کی قسم حلال کی ہے بیگم صاحبہ پہن سکتی ہیں۔

خاک کے پتلے کو ہے خاک سے رغبت کتنی
جان دیکر بھی یہ لیتا ہے زمیں تھوڑی سی

ہاتھ پھیلائے جو مر کر بھی چلا ہے انسان
مانگتا جاتا ہے دنیا سے زمیں تھوڑی سی

سیکھ دانے سے زمانہ میں چلن دانا کا
دیتا انبار ہے لیتا ہے زمیں تھوڑی سی

وفائے دلبراں ہے اتفاقی

شام ہو رہی تھی۔ بانکے ترچھے جوان، رنگیلے رنگ رسیا۔ جوبن نکھار سرِ بازار چلے جا رہے تھے۔ میں چھت پر کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ایک کنکھیوں سے دیکھتا گذر جاتا تو دوسرا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا جیسے گھول کر پی جائے گا۔ کوئی دور سے دیکھتا آتا مگر قریب پہنچکر آنکھیں نیچی کر لیتا جیسے دیکھا ہی نہیں اور کوشش کر کے اپنی چال ڈھال میں حتی الوسع دلبری پیدا کرتا ——— مردِ اپنے جال پھیلائے جعل سازی کے بازار میں آرہے تھے۔ یہ ہم کو شکار کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کا یہاں آنا اس کا ثبوت تھا کہ خود شکار ہو چکے ہیں اور بندھے چلے آرہے ہیں ——— یہ ان سوٹڈ بوٹڈ صاحب کا تیسرا چکر ہے۔ ساتویں پر اللہ نے چاہا تو پھنس جائیں گے یہ پھیروں کا پھیر ہوتا بُرا ہے۔ میں انہیں دیکھ کر مُسکرا دی تھی۔ جب سے کاوے کاٹ رہے ہیں اور لطف یہ کہ ہر دفعہ خیر سے چال بدل لیتے ہیں. کبھی چندن چکور کی طرح آتے ہیں تو کبھی مور کی طرح غرض کہ ہوس اپنی چال چل رہی ہے اور انسان کو جانور بنا رہی ہے۔

اتنے میں حضرتِ آہ سامنے سے گذرے۔ یہ بھی ایک رقم ہیں۔ کلام سُنانے کی انہیں بدھضمی ہے موقع بے موقع اُگلنا شروع کر دیتے ہیں اور ماشاء اللہ چھت توڑ دیوار پھاڑ آواز پائی ہے۔ ہم لوگ انہیں ہاتھی چنگھاڑ کہتے ہیں۔ آپ کی دعا سے، شاعری کا ٹریڈ مارک ہیں۔ انجان بھی ایک نظر میں جان جائے کہ ہیں کوئی مفکر بال بکھرے۔ گریباں چاک، اچکن کے بٹن کھلے، منہ میں پان بھرا ہوا، اس دھج سے اکثر کوٹھوں پہ بیٹھے یا چادری میں چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ ایک دم بیٹھے بیٹھے غائب ہو جاتے ہیں۔ اب آپ بات کئے جائیے۔ جواب ندارد۔ تھوڑی دیر بعد اس جسدِ بے جان میں سے صُور کی سی آواز پیدا ہوتی ہے اور کہتے ہیں۔ بھئی ذرا ہنسل

دینا ——— یہ اُن کی پیٹنٹ ادا ہے
اور سارا بازار اس سے واقف۔ ہر کوٹھے پر دس بیس
سو پچاس مرتبہ یہ کیفیات ان پر طاری ہو چکی ہیں۔
میلوں۔ تماشوں میں ضرور جاتے ہیں۔ لیکن سب
سے الگ ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی کہے جناب آہ
صاحب آئیے تشریف لائیے، الگ الگ کیوں پھر
رہے ہیں تو جواب ملتا ہے ذرا فکر کر رہا ہوں ———
خیر سے جنگل بیابان ہو حق میدان اکیلے کنج میں نہیں
ملتے۔ جاتے بھیڑ بھڑکا ہی میں ہیں۔ پر رہتے ہیں ذرا
لگ الگ، یہ بھی اِک ادا ہے ———
ہم طوائفوں کو ان سے یہ فائدہ ہے کہ کوئی تقریب ہو
یہ اُلٹے سیدھے شعر کہہ کر لا دینگے۔ کسی کے ہاں بچہ ہو یہ
بن کہے تاریخی نام نکال لاتے ہیں، کسی کے گھر شادی
ہو، ایک چھوڑ دس دس سہرے موجود اور پھر مزا یہ
کہ سارے کنبہ کے نام شعروں میں دیکھ لیجئے۔ مع
رشتہ کے کسی کی اماں خالہ چچی تائی مرے، مرثیہ
لکھ دیتے اور پھر ایسے بسور بسور کر پڑھتے ہیں کہ ان
ہوئے کو ہنسی آجائے ——— ایک دن تو
مجھے مروا ہی دیا ہوتا۔ اختر کی نانی مر گئیں، میں بھی
تعزیت کو گئی۔ اور بھی بہت سی جمع تھیں کہ اتنے
میں حضرت آہ آن پہنچے۔ ہیں خیر سے بوڑھے، بطور
ہمدردی فرمانے لگے۔ بھئی اختر پرسوں ایک مولوی
صاحب وعظ میں فرما رہے تھے کہ مرنے والے کے
جتنے گناہ ہوں اتنے نفل اگر پڑھوا دئے جائیں تو
بخشش ہو جاتی ہے سو مرحومہ کے گناہ تو تم کو کیا
یاد ہو سکتے ہیں، خیر جتنے بھی پڑھو اسکو پڑھوا دو
دو چار لاکھ بھی ہو جائیں تو غنیمت ہے۔ کچھ تو
بوجھ کم ہو ہی جائے گا۔ ان کا تو یہ کہنا اور میرے
پیٹ میں بل پڑنا۔ اب لاکھ روکتی ہوں پر رہ رہ
کر دل میں گدگدیاں اُٹھتی ہیں اور شاعر صاحب
ہیں کہ اشاروں ہی اشاروں میں روک رہے ہیں
اور اشارہ بھی اس کی عنایت سے الفاظ سے واضح
تر، اور کچھ ایسے بونگے، بے سُرے جنھیں دیکھ کر اور
ہنسی آئے۔ آخر جب کچھ بَن نہ پڑی تو جھلا کر بولے
"مخندی"[1]! بس کچھ نہ پوچھو، ان کا تیور بدلکر ایرانی
لہجہ میں یہ کہنا تھا اور میرے ہاتھ سے دامانِ ضبط کا
چھٹنا ——— میں سمجھ گئی کہ فارسی میں
متنبہ فرما رہے ہیں پر میں بھی اس وقت ایسی
انجان بنی کہ مزا ہی آگیا اور اُلٹا شاعر صاحب
کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔ بگڑ کر بولی کچھ باؤلے

[1] شاعر صاحب کو فارسی واجبی ہی واجبی آتی ہے۔

تو نہیں ہوئے ہیں آپ۔ یا کہیں بوٹی پی لی ہے غضب خدا کا گالیاں دینے پر اُتر آئے، وہ بھی سٹ پٹا گئے، بولے کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے کہا اے ہاں "خندی خندی" کہے جاتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ جو موتی کا گھر نہ ہوتا تو ابھی مزاج درست کر دیتی۔ میری طرف مایوسانہ انداز سے دیکھا اور کہا اُف! اندھے کے آگے روئیے اور اپنے ہی نین کھوئیے۔ بی جان! غلطی میری ہی تھی۔ بھلا آپ فارسی کیا جانیں۔ خیر میں معافی چاہتا ہوں۔ اتنا کہہ اختر کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ لو بی تم مرثیہ سنو۔ رات بھر میں لکھا ہے۔ کل چوکٹے میں لگوا لاؤں گا ——— غرضکہ یہ اس قماش کے ہیں۔

سڑک کے ایک کنارہ کیلے والا چھبیا لئے بیٹھا ہے۔ بازار کے کچھ شہدے بدمعاش گرد جمع، کھاتے جاتے ہیں اور چھلکے بیچ سڑک پر ڈالتے جاتے ہیں۔ لوگ پھسل رہے ہیں یہ ہنس رہے ہیں۔ مزا اسی میں ہے کہ دوسرا بے مزا ہو کیلے والے کے بھی گہرے ہیں۔ گویہ سستے خرید رہے ہیں پر بکری تو ہو رہی ہے اور چھلکس مفت ہیں۔ ایک موٹے سے شیخ جی جو اپنے دھیان میں گذرے، پیر چھلکے پر پڑا۔ بھد سے آن پڑے تین من کی لاش (نعش) کیلے غریب کی کیا بساط یہ تو دیگ پر گریں تو پچک جائے۔ سارے کیلے ختم ہو گئے۔ کچھ ان کے گرنے میں اور کچھ ان کے اٹھنے میں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ؎

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

یہ تماشا دیکھ رہی تھی کہ منڈیر پھلانگ میری پڑوسن گوہر آن پہنچی اور کہنے لگی ؎

دیوار پھاندنے میں دیکھو گی کام میرا
جب دھم سے آ کہونگی صاحب سلام میرا

میں بولی بیگم جو یوں ہی دیواریں پھاندتی رہیں تو ایک نہ ایک دن کو توالی چبوترہ دیکھنا پڑیگا۔ بولی دیکھا جائے گا ——— میں نے کہا تیری خطا نہیں، یہ تیرے نام کا قصور ہے۔ آبِ گوہر ساز سورج سے ساز باز کر آغوشِ قلزم چھوڑ بادلوں میں جا پہنچتا ہے۔ پھر ابرِ نیساں کے جوڑے میں سے ٹپک سیپی کے سینہ میں جگہ کرتا ہے۔ لیکن وہاں بھی قرار سے نہیں رہتا۔ کچھ دن گذار اس کا گھر اُجاڑ چادر آب چاک کر بازار میں جا پہنچتا ہے ——— لیکن ہر فرعونے راموسیٰ انسان اس کا سینہ بر بار ریشم کے ڈورہ میں

پر دکنونڈا بنا لیتا ہے ——— اَبر و آب کے
جوفِ شق کر کے نکل آنے والا اس قادر کے رو برو
مجبور ہو جاتا ہے۔ پر جیتر نار تو انسان کے بس میں
بھی نہ آئی۔ موتی تو خانۂ صدف سے نکلتا ہے، تو
ایسی گوہر ہے جو انسان کے گھر تک سے نکل آئی۔
سچ ہے "رنڈی اور راتا نکلے پہ نکلے"۔

گوہر خاموش ہو گئی۔ چار کوٹھوں پرے لڑکے
کنستر بجا رہے غل مچا رہے تھے۔ قصّہ یہ تھا کہ برابر
کے درخت پر کبوتر بسیرا لینے جا رہے تھے، اور یہ
شیطان کے چیلے انہیں اڑا رہے تھے ———
کبوتر منڈلا منڈلا کر جاتے، جب نشیمن کے قریب
آتے تو یہ غل مچا دیتے۔ گوہر نے ایک کنکری کھینچ کر
ماری اور لڑکوں کو للکاری کہ خبردار جو کبوتروں
کو ستایا ہو گا۔

بچے جاننے والیوں کے بھی رعب میں آ گئے ہیں
بولی دیوانی! بچوں کے منہ لگتی ہے۔ اس نے کچھ
جواب نہ دیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں میرے کہے کا
برا تو نہیں مان گئی۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ بتا رہے
تھے کہ سینہ میں تلاطم بپا ہے۔

میں دل ہی دل میں اپنے کو لعنت ملامت
کرنے لگی کہ دوست کی دکھتی رگ کیوں دبائی۔
یہ سچ ہے کہ گوہر ایک کے گھر جا بیٹھی تھی۔ اور یہ بھی سچ
ہے کہ ٹکی نہیں پر مجھے کہنے کی کیا پڑی تھی ———
میں نے کہا کیا خفا ہو گئی۔ بولی باؤلی تجھ سے خفا
ہوں گی؟ تو نہیں جانتی یہ مثل مردوں کی بنائی
ہوئی ہے۔ کاش کوئی بندۂ خدا طوائف سے بھی
پوچھتا کہ وہ کیوں نہیں ٹکتی۔ تو معلوم ہو جاتا کہ
وہ کم نصیب خانماں برباد تو اپنی سی سب کچھ
کر لیتی ہے اسے ٹکنے دیتے نہیں۔

تو جانتی ہے میں اپنی پسند والے کے ساتھ
گئی تھی اور عورت کو جو مرد پسند آ جائے اس کے
لئے ساری کڑیاں جھیل لیتی ہے۔ لیکن ہمارے
سماج میں ایک شریر لڑکوں کا گروہ ہے جنہوں
نے مجھے بسیرا نہیں لینے دیا۔ کنستر پیٹے۔ غل مچایا
درخت کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور شاخِ آشیاں پہ
ٹکنے نہ دیا۔ جب مجھے شاخ ہی ٹوٹتی نظر آئی تو
وہاں سے اُڑ آئی کہ شاخ تو رہ جائے۔ کسی
اور ہی کے کام آئے گی۔

اچھا خدا حافظ۔ اب ہم جاتے ہیں۔ میں نے
کہا پوری بات تو سنا جا۔ بولی۔ ع۔ کبھی فرصت
میں سن لینا۔ بڑی ہے داستاں دل کی۔

دیوانی کی کہانی اسکی اپنی زبانی

جیسے کوئی سازِ شکستہ آخری مضراب کی آس دے رہا ہو۔ یا سینہ کے گنبد سے ارتعاشِ دلِ مرحوم کی گونج اُٹھ رہی ہو یا قبرستان کے سنسان میں مُردہ چھوڑ کر جانے والوں کو آواز دے رہا ہو۔ بعینہ اس طرح جاڑے گرمی برسات صبح چار بجے یہ آواز آیا کرتی تھی۔

سونا لینے پی گئے اور سونا کر گئے دیس،
سونا ملا نہ پی ملے مرے دھولے ہوگئے کیس

اور نہ صرف میری بلکہ اکثر سننے والوں کی نیند اُڑا دیتی تھی۔

آج دل نہ مانا اور میں کوٹ گلے میں ڈال باہر نکل آیا۔ ایک دیوانی بال بکھیرے چیتھڑے لگائے سامنے سے گذری ——— یہ ایک بجھی ہوئی انگیٹھی تھی جس میں آنکھوں کے دو انگارے رہ گئے تھے۔ ایک جسدِ بے جان تھی جس کی چشم وا میں ابھی جان باقی تھی۔

غم میں ایک کشش ہے جو عیش و مسرت میں نہیں ——— واللہ کہ آہ میں ایک دلبری ہے جس سے واہ محروم۔ نالے میں ایک لے ہے جو ہر ساز پر ممنوع۔

میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ گلی گلی کوچہ کوچہ چوک اور بازار میں سے یہ گاتی گذرتی گئی۔

یہ طلسم اشتہا کی معمول اپنی قسمت کا رزق لیتی مقدر کا چکر پورا کرتی اسٹیشن کے پاس ایک درخت کے نیچے جا بیٹھی یہ اُس عورت کا مرقد تھا جو مقدر شدہ منازلِ حیات طے کرنے سے پہلے مر چکی تھی اور اب حیاتِ قاہرہ کے ہاتھوں مُردہ بدست زندہ کی طرح باقی ماندہ سہ و سال گذار رہی تھی۔

عمر قیدی کی میعادِ سزا ابھی باقی تھی۔ بھگت رہا تھا۔

میں نے پوچھا تم کون ہو۔ کہا۔ دیوانی
میں نے کہا دیوانی کیوں ہو گئیں۔ بولی وہ نہیں آئے۔
میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کون نہیں آئے۔

جواب ملا - پی -

یہ اس پپیہے کی پی تھی جو اس لفظ پر دَم توڑ رہا ہو۔ مرنے والے کی تیسری ہچکی تھی بچھڑنے والے کی آخری نگاہ -

میرے آنسو نکل پڑے -

بولی روتے کیوں ہو۔ کیا تمہارا پی بھی بچھڑ گیا۔ تمہارا گھر بھی اُجڑ گیا۔ رونے سے وہ نہیں آئیں گے۔ میں بہت روئی۔ پر وہ نہیں آئے اب رونا بھی نہیں آتا -

اتنا کہہ جو کچھ مانگ کر لائی تھی نکال نکال کر کھانے لگی۔ آپ ہی آپ بڑبڑاتی جاتی تھی -

آؤ تم بھی کھالو -

میں نے کہا۔ نہیں

بولی - تم نہیں - تم نہیں -

کھانا ٹھنڈا ہے میں گرم کروں گی -

اتنا کہہ ہاتھ کا نوالہ چھوڑ اُٹھ کھڑی ہوئی ایک کونے میں چند سوکھی ٹہنیاں پڑی تھیں انہیں اکٹھا کر کہیں کونے میں سے دیا سلائی کا بکس نکال آگ سلگائی اور بولی -

تیرے پیٹ میں بھی آگ لگ رہی ہے۔ لے تو بھی کھالے۔ اتنا کہہ دو نوالہ جلتی ہوئی لکڑیوں میں ڈال دئے۔

گدڑوں کے نیچے سے ایلومینیم کے ٹفن کیریر کا ایک کٹوردان نکالا۔ اس میں تھوڑا سا کھانا پڑا تھا۔ بولی -

لو یہ تمہارا کل کا حصّہ بھی یوں ہی رکھا ہے جانے دو باسی نہ کھاؤ۔ تمہیں باسی کھانا بھاتا بھی نہیں۔ کسی فقیر کو دے دوں گی -

کٹوردان کو خوب اچھی طرح صاف کیا۔ کھانا بہت سلیقہ سے گرم کیا ——— عورت تو دیوانی ہونے کے بعد بھی گھر والے کا خیال آتے ہی گھرداری کرنے لگتی ہے۔ اللہ رے فطرت پھر بولی -

اچھا تو لو آؤ دو نوالہ کھالو تمہیں ہماری قسم مزے کا نہیں ہے۔ سچ کہہ رہے ہو۔ خدا کی قسم جب سے تم گئے گھر میں کھانا مزے کا پکا ہی نہیں۔ اچھا تو میں کھائے لیتی ہوں۔ تم نوکری سے آکر کھا لینا۔ نہیں تو بھائی کے ہاتھ بھیجدونگی ——— بھائی بھی روٹھ گیا اب آتا ہی نہیں۔ کھانا بھی تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ آخر کیوں خفا ہو گئے۔ من جاؤ۔ اب تو تمہاری قمر تھک گئی ——— اچھا نہ کھاؤ۔ تمہاری

خوشی یہ تمہارا حصہ رکھا ہے۔ جب دل چاہے کھا لینا۔

پریم کی ماری نے آدھے سے بہت زیادہ اپنا پیٹ کاٹ کر نہ آنے والے کیلئے کٹوردان میں چھوڑ دیا۔

پھر بجھی ہوئی لکڑیوں کے پاس یہ سُلگتا ہوا دل بیٹھ گیا۔ اور منہ سے یہ آواز جاتے ہوئے یار کی پرچھائیں کی مانند نکلی۔

سونا لینے پی گئے اور سُونا کر گئے دیس
سونا ملا نہ پی ملے مرے دہولے ہو گئے کیس

میں نے کہا۔ کہاں گئے تھے۔

بولی۔ کنگن لینے —— پڑوسن کے کنگن بڑے اچھے تھے۔ پر تم سے اچھے نہیں۔ تم آجاؤ کنگن نہیں چاہئیں۔ ہم نے تو چوڑیاں بھی توڑ دیں سنگار کرنا بھی چھوڑ دیا۔

اتنا کہہ پھر وہی دوہا گانے لگی —— پھر منہ ہی منہ میں کچھ کہنے لگی۔

سنا تھا تمہیں سردی لگ گئی ہمیں تو سردی نہیں لگتی جب سے تم گئے ہو اندر انگیٹھی سی سلگ رہی ہے۔ آؤ ہاتھ سینک لو —— ہم تو رضائی بھی نہیں اوڑھتے۔ تمہارے لئے الگ رکھ چھوڑی ہے۔

برہا کی ماری نے ایک کونے میں پرانی رضائی ڈال رکھی تھی۔ خود جاڑے مرتی تھی اور اسے کسی گرم دسرو سے بے خبر کے لئے لگا رکھا تھا۔

عورت ایثار تیرے خمیر میں ہے۔ خود فراموشی تیرے ضمیر میں —— بزمِ ہستی کی مالن تو مُردہ درختوں کی آنسوؤں سے آبیاری کرتی ہے۔ اپنی ہڈیوں کی کھاد دیتی اور خونِ جگر سے سینچتی ہے۔

شمعِ کشتہ پہ فانوس ڈھکنے والی تیرے قلزمِ قلب میں اُس جسدِ بے جان کا ٹھکانا ہے جسے سمندر بھی نکال پھینکتا ہے۔

زمیں میں دب کے سینہ چیر ڈالا خاک کا اس نے
مری نظروں میں ہی دانہ کا بڑھ کر گلستاں ہونا

بہادر شاہ کا خواب

ایک پیر نود سالہ پلنگ پر پڑا کروٹیں بدل رہا ہے۔
غلافی ڈبڈبائی ہوئی چشم نیم باز بھیگی ہوئی خمار آلود راتوں کی غمازی کر رہی ہے۔
بگلا سے سفید بالوں کے چکر سیل لیل و نہار کے گردابوں کی خبر دے رہے ہیں۔
دانتوں کے کھنڈر رزالہ باری روزگار سے آشنا کرتے ہوئے زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ہماری دست بُرد میں کبھی لعل لب رہے ہیں۔
جُھلسا ہوا گلابی رنگ رنگی ہوئی محفلوں اور تلوّنِ روزگار کا پتہ دے رہا ہے۔
اور جُھریایا ہوا چہرہ کتابِ عیش کے مسلے ہوئے ورق اور سیجوں پر ملے ہوئے پھول کی طرح بستر پر پڑا ہے۔ یہ واقعہ شہر رنگون کا ہے۔ یہ گھر زندہ بہادر شاہ کا آخری مرقد اور یہ بوڑھا فراموش کردۂ مرگ، ہندوستان کا آخری تاجدار صحیفۂ زوالِ مغلیہ کا آخری باب ابوظفر بہادر شاہ ہے۔
کلمہ پڑھ کر اُٹھا اور یہ شعر پڑھا:-

زمانہ ہو گیا جب کی تھی باغِ حُسن کی سیر
نہ جانے کیوں ہے نگاہوں میں وہ بہار ابتک

اور ایک آہ کی۔
اس ماں کی سی آہ جو سپردِ خاک دلاور کو خواب میں دیکھ کر اُٹھے ——— صحرا میں مرتے ہوئے کی سی آہ جسے موت کا بازیگر دور سے چشمہ دکھا رہا ہو ——— کنجشک صحرائی کی سی آہ جس کے زخمی بچّوں کو شکاری تھیلے میں ڈال کر لے جا رہا ہو ——— اس ہنس کی سی آہ جو اپنے جوڑے کی لاش پر سے اُڑایا جا رہا ہو۔
اس ستم زدۂ روزگار کے جسم کا رواں رواں رو رہا تھا لیکن آنکھیں خشک تھیں اس گلو سوختہ کا ساتھ ان چشموں نے بھی چھوڑ دیا تھا۔
میں ستون سے لگا کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب اس مجسمۂ غم کو سکوت و جمود کے ساتھ نہ دیکھ سکا تو میں دو قدم آگے بڑھا۔ اور پوچھا نصیبِ دشمناں مزاج کیسا ہے ———

میری جانب نظر اُٹھائی جیسے کنویں میں ڈوبتا ہوا آسمان کو دیکھے، اور کہا ماں! یہ خواب میرا پیچھا نہیں چھوڑتے —— جس ماضی کا خیال بھی کرنا نہیں چاہتا وہ خواب بن بن کر آتی رہتی ہے —— ابھی ابھی جشنِ ماہتابی دیکھ رہا تھا —— کہاں یہ تیرہ روزگار۔ کہاں وہ جگ مگ جگ مگ دنیا۔ قرانِ السعدین اسی کو کہتے ہیں۔

حضور شاہجہاں کی لال حویلی دُلہن بنی ہے در و دیوار، شجر و حجر پہ بادلا بکھرا ہے۔ آسمان کے سینہ پہ ایک چاند ہے، لال قلعہ کی زمین پہ ہزاروں چمن تاروں بھرا دوپٹہ اوڑھے تاروں پہ چشمک زنی کر رہا ہے۔

زمرد کی زمین پہ الماس بکھرے ہیں، سیم ساق انہیں روند رہے ہیں۔

قدم قدم پر بوٹے بادلا لپیٹے، چاندی کے پنجرہ میں ہیرامن طوطا معلوم ہو رہے ہیں۔

ماہرو چاند کو شرماتے چہلیں کرتے پھر رہے ہیں، چاندنی ان کے پیروں میں لوٹ رہی ہے۔ شبِ ماہ کے مزے۔ آبِ رواں کا لُطف نوخیز نوعمر نوعروسوں کی ہنسیاں —— فضا میں خمار ہے۔ پتہ پتہ جھوم رہا ہے۔

سب سفید کپڑے پہنے ہیں۔ میرا جامہ زری لفت کا ہے، کُرتہ تن زیب کا —— اتنا کہا تھا کہ اپنے کپڑوں پر نظر پڑی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا —— ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا۔

—— سر پکڑ کر ہو بیٹھا اور تھوڑی دیر تک ٹوٹے ٹوٹے یہ بول سُنائی دیتے رہے ——

—— نہ جانے کیوں ہی نگاہوں میں وہ بہار ابتک۔

نہ کھینچے تن سے اپنے شفق جو انجم کو
نہ تختہ سہ و پروین پہ پھر بہار آئے

گناہ

کیرکٹرز

رضا۔ عمر تقریباً پچاس سال۔ رنگ سُرخ و سپید۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ ستواں ناک۔ پتلے ہونٹ۔

حامد۔ عمر تقریباً چالیس سال۔ رضا کا دوست۔

اختر۔ عمر تقریباً چالیس سال۔ رضا کا دوست۔

مے یاروز۔ رضا کی داشتہ یورپین عورت عمر تقریباً پچیس سال۔ نازک اندام۔ شوخ چشم۔

یوسف۔ روز کا دوست عمر تقریباً تیس سال۔ گندمی رنگ۔ تنگ چشم۔

ریاض۔ رضا کا بیٹا عمر تقریباً بیس بائیس سال خوبصورت جوان۔ سُرخ و سفید رنگ۔ غلافی آنکھیں۔ ورزشی بدن ستواں ناک۔

سعید۔ عمر تقریباً بائیس سال۔ سانولا رنگ۔ مہذب نوجوان معمولی صورت۔

شمیم۔ سعید کی بہن۔ عمر تقریباً سترہ اٹھارہ سال۔ خوبصورت تعلیم یافتہ لڑکی۔

نسیم۔ شمیم کی سہیلی اور اس کی ہم عمر۔ شوخ چشم گرم گفتار ولے باعصمت۔

مہ نو۔ ریاض کی منگیتر۔ سرو قامت۔ آہو چشم پتلی ستواں ناک۔ لمبے لمبے بال۔ تعلیم یافتہ لڑکی۔ عمر تقریباً سترہ سال۔

حمید۔ مہ نو کے چچا۔ ادھیڑ عمر۔ بھاری بدن۔

ملازمین وغیرہ۔

سین (۱)

کلب (شام کا وقت)

رضا۔ حامد اور اختر کلب کے سامنے صحن میں
ایک میز کے گرد بیٹھے ہیں۔

حامد۔ آبدار۔

(آبدار آکر قریب کھڑا ہو جاتا ہے)

حامد۔ (اختر سے) آپ کے واسطے کیا منگواؤں؟

اختر۔ چھوٹا وسکی۔

حامد۔ (رضا سے) آپ کے واسطے؟

رضا۔ ایکوا پیورا۔ یعنی سادہ پانی۔

حامد۔ یہ جناب ٹی ٹوٹلر کب سے ہوئے؟

رضا۔ چند روز سے۔

حامد۔ (بوئے سے) دیکھو! صاحب کے واسطے کوک ٹیل لاؤ اور لو (سمنان) ڈال کر۔

رضا۔ کیوں بیکار منگوا رہے ہو میں نہیں پیوں گا۔

حامد۔ (بوئے سے) جاؤ..... اور دیکھو! ایک چھوٹا ہمارے واسطے۔

(بوئے چلا جاتا ہے)

حامد۔ (رضا کو سگرٹ پیش کرتے ہوئے) لیجئے جناب دھرمی بالک صاحب شوق فرمائیے۔ شریف بچوں کی آوارگی کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ پہلے تمباکو کی دھواں دھار پری کا دم بھرتے ہیں پھر شیشے کی پری کی باری آتی ہے۔

رضا۔ میں اس سے بھی محروم ہوں۔

اختر۔ (چونک کر) یہ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟

رضا۔ کچھ نہیں! ع

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اختر۔ مطلب؟

رضا۔ مطلب یہ کہ چند روز سے مجھے اختلاج کی سی شکایت معلوم ہوتی تھی۔ دو روز ہوئے رگھوناتھ ہارٹ اسپیشلسٹ کو دکھایا۔ فرماتے ہیں ہلکٹ بیٹنگ ہے۔ دوا تجویز کر دی ہے۔ تمام لوازمات زندگی سے پرہیز بتا دیا۔ بس یوں سمجھئے کہ پرہیزگاری کا پروانہ حوالہ کر دیا۔

(بوئے ٹرے پر گلاس اور سوڈے کی بوتلیں لاتا ہے)

حامد۔ (رضا کے سامنے کوک ٹیل کا گلاس رکھتے ہوئے) اچھا پیتے نہیں تو کم از کم سامنے تو رہنے دو۔

رضا۔ اچھا یوں بھی سہی ہ

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یارو! ہم اس ڈاکٹر کے ہاتھوں عاجز آ گئے ہیں فرماتے ہیں کوئی صدمہ نہ ہونے پائے ورنہ دل کی

حرکت بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بھلا اس بلبلول
سے کوئی پوچھے کہ یہ صدمہ کیا کم ہے۔ ع
مے کہ خورند حریفان ۔ من نظارہ کنم
یار پئیں اور ہم بیٹھے منہ دیکھا کریں۔
(یہ کہکر سب گلاس اٹھاتے ہیں، رضا بھی
اٹھاتا ہے، سب ہونٹوں سے لگالیتے ہیں، رضا
ہونٹوں تک لیجا کر افسردہ خاطر ہوکر گلاس میز پر
رکھ دیتا ہے)

حامد۔ (رضا کی طرف مخاطب ہوکر) بھئی یہ ڈاکٹر
رگھوناتھ دل کا خاص معالج ہوگا۔ پر یاروں کی
یہ بات تو تم لکھ لو۔ اس کے دماغ کی ایک آدھ چول
ضرور سرکی ہوئی ہے۔ اس سے کہیئے دماغ کا علاج
کروائیے۔ کدال سے فصد کھلوائیے۔ غضب خدا کا
آپ انگور اور دل کو مضر۔ لاحول ولا۔ بڑا ڈاکٹر
بن کر آیا ہے۔ جغد کہیں کا۔

اختر۔ ؎ پی بھی لے زاہد جوانی میں شراب
عمر بھر ترسے گا اس دن کے لیے

رضا۔ جوان اب سے، کون؟

حامد۔ سرچشمۂ شباب کو چھوڑ دو گے تو آپ سے آپ
جوانی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

برابر دور چل رہا ہے، گلاس خالی ہوتے ہیں،
بھرے ہو جاتے ہیں۔ اب ذرا ذرا نشے ہو چلے ہیں۔

حامد۔ ہاں تو ڈاکٹر رگھوناتھ کے تابعدار مریض صاحب!
آپ آج بیٹھے منہ ہی تکا کریں گے۔ ؎
(گلاس کے کنارہ کو بوسہ دے کر)
یار لیں محفل میں بوسے جام کے
تم رہو لب تشنہ اک پیغام کے

اختر۔ (رضا سے) یار ہمارے کہنے سے آج تو اور پی
لو۔ کل سے پرہیز شروع کر دینا۔

رضا۔ اتنا اصرار نہ کرو کہ مجھے انکار کرتے ہوئے
شرم آئے۔

اختر۔ بجا ارشاد ہوا۔ جناب نے تو پہلی ہی دفعہ
انکار فرما دیا تھا۔

حامد۔ (مخمور انداز میں) اور ہم نے پہلی دفعہ کا انکار
کسی کا بھی نہیں مانا۔ ع
ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی

آسمان پر گھٹا کا آنا۔ کچھ بجلی کوندتی ہے۔ قدرے
کڑک ہوتی ہے۔

اختر۔ بجلی کوندتی ہوئی دیکھ کر ؎
کوندنا برق کا بادل میں یہ کہتا ہے امیر
کوئی بیتاب ہے پردہ سے نکلنے کے لیے

حامد (رضا سے) پی بھی لے یار کہاں کا پرہیز ؎

پینے کے یہی دن تو ہیں ساقی اگر آئے
شیشے کی پری ابر میں اُڑتی نظر آئے

رضا خاموش بیٹھا مسکرا رہا ہے اور گلاس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا جاتا ہے۔

اختر۔ (آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ؎

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج

حامد۔ (رضا کا گلاس اٹھا کر اسکی طرف بڑھاتے ہوئے) ؎

داغ یہ مئے ہے یہ ساغر ہے کہاں کی توبہ
پی بھی لے مردِ خدا بہرِ خدا تھوڑی سی

رضا۔ (پہلے گلاس کی طرف دیکھتا ہے پھر آسمان کی طرف)

؎ بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم
بہارِ توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم

پھر حامد کے ہاتھ سے گلاس لے کر ؎

برسات کے آتے ہی زاہد نہ رہی توبہ
بدلی جو نظر آئی بدلی مری نیت بھی

(گلاس پی جاتا ہے)

اختر۔ ع مرے شیر شاباش رحمت خدا کی ؛
بھئی رضا میں یہ بات لاکھ روپیہ کی ہے۔ یاروں کا کہنا کبھی نہیں ٹالتا۔ بوسے۔۔۔۔۔۔ (بوئے کا آنا) صاحب کے لئے ایک بڑا۔

رضا۔ جون ہیگ۔

حامد رضا کو سگرٹ دیتا ہے، وہ سلگاتا ہے، بوئے گلاس اور سوڈا لاتا ہے اور حب ہدایت سوڈا ڈالتا ہے۔

رضا۔ (گلاس ہاتھ میں لے کر) ع

توبہ سے توبہ کرتا ہوں ساقی پلا مجھے

آج یاروں کے ساتھ آخری دفعہ اور پی لیں کل سے چھوڑ دیں گے۔

حامد۔ ارے یار کل کس نے دیکھی ہے۔ ؎

ساقیا عشرتِ امروز بفردا مفگن
یا زِ دیوانِ قضا خطِ امانے بمن آر

سین (۲)

رضا کی داشتہ میم ہے اور اس کا دوست یوسف، شام کا وقت، اندرون کمرہ رائٹنگ ڈسک پر ایک یورپین عورت ہندوستانی کپڑوں میں بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے۔ قریب ایک ہندوستانی نوجوان سوٹ پہنے ڈسک پر انگلیاں ٹکائے کھڑا ہے۔

عورت۔ (قریب کھڑے ہوئے جوان کی طرف مُنہ اُٹھا کر) کیا لکھوں؟

مرد۔ (مُسکرا کر) بجا ارشاد ہوا۔ آپ اپنے شوہر کو

خط لکھ رہی ہیں یا میرے کسی بزرگ کو؟ جو میں لکھواؤں۔ جو تمہارا دل چاہے لکھو۔

عورت۔ میرا دماغ تو اس وقت کام نہیں کر رہا۔ تم بتاؤ۔

مرد۔ (اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر) لکھو۔ میرے بوڑھے دولھا میاں!

عورت۔ (منہ اٹھا کر) دولھا میاں کس کو کہتے ہیں؟

مرد۔ Bride groom کو کہتے ہیں۔

عورت۔ You silly

مرد۔ اچھا تو پھر جو تمہارا دل چاہے لکھو۔ ہم سے پوچھتی ہی کیوں ہو۔

عورت۔ (تھوڑی دیر سوچ کر سر سہلا کر) میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم کیوں نہیں بتاتے؟

مرد۔ میں کہتا ہوں جلدی سے لکھ لکھا کر جھگڑا کاٹو۔ کہیں رضا نہ آ جائے۔

عورت۔ اوں ہوں۔ وہ ابھی نہیں آئیں گے۔ میں نے کلب ٹیلیفون کر کے پوچھا تھا۔ ہاں تو بولو کیا لکھوں؟

مرد۔ تم اب تک خطوں میں کیا لکھتی رہی ہو؟

عورت۔ میں تو ڈارلنگ لکھا کرتی تھی۔

مرد۔ تو پھر ڈارلنگ ہی سہی۔

عورت۔ (مرد کی طرف تیکھی چتون سے دیکھ کر گردن نیوڑھا کر) نہیں۔

مرد۔ (مسکرا کر) میری خاطر سے۔

عورت۔ (لکھتے ہوئے) اچھا تمہاری خوشی ہے تو خیر یوں ہی سہی۔ آگے؟

مرد۔ (فکر کے انداز میں سر سہلا کر) اب مجھے تم سے محبّت نہیں ہے۔

عورت۔ (لکھتے ہوئے) اب۔ مجھے۔ تم سے محبّت نہیں ہے۔ (مرد کی طرف دیکھ کر) اور محبت تھی کب؟

مرد۔ (ذرا تعجب سے) تو کیا تم کو رضا سے کبھی بھی محبّت نہیں تھی؟

عورت۔ (چڑ کر) کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ تم سمجھتے ہو مجھ کو اس بڈھے سے کبھی محبّت ہو سکتی تھی؟ اچھا آگے بولو۔ وقت خراب مت کرو۔

مرد۔ (خط کو دیکھ کر) ہے! تم اردو تو خاصی لکھ لیتی ہو۔ کیا رضا نے سکھائی تھی؟

عورت۔ تھوڑی ہم کو پہلے آتی تھی۔ تھوڑی رضا نے سکھائی۔ آگے بولو۔

مرد۔ کیا لکھا ہے تم نے؟

عورت۔ اب مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔

مرد۔ (غور کے انداز سے ماتھے اور آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) اور بغیر محبت کے تمہارے ساتھ رہنا غلطی ہے۔ اس کے علاوہ اب تمہاری صحت خراب ہو گئی ہے اور ایک بیمار کے ساتھ زندگی گزارنی مجھے پسند نہیں۔

عورت۔ (مرد کی طرف دیکھ کر) نرسنگ کا ہم کو کبھی شوق نہیں تھا۔

مرد۔ (عورت کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے) کیا لکھا؟

عورت۔ ایک بیمار کے ساتھ زندگی گزارنی مجھے پسند نہیں۔

مرد۔ میری تلاش بے سود ہے۔ میں ایک دوست کے ساتھ جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔

یہ خط لفافہ میں بند کر اس پر مسٹر رضا لکھ دے کھڑی ہو جاتی ہے۔ مرد اٹیچی کیس جو قریب ہی رکھا ہے اُٹھا لیتا ہے، اور دونوں ڈرائنگ روم میں سے گزرتے ہیں، بیچ میز پر لفافہ رکھتے ہوئے عورت کہتی ہے:۔

عورت۔ گڈ بائی رضا (Good bye Raza)

مرد۔ (گھر سے باہر جاتے ہوئے) ہے! تم آج سے

اپنا نام "رودز" کر دو تاکہ رضا تلاش نہ کر سکے۔

عورت۔ آل رائٹ (All right)

باہر موٹر کھڑی ہے، اٹیچی کیس پیچھے کی سیٹ پر ڈال دونوں آگے بیٹھ چل دیتے ہیں۔

سین (۳۱)

کلب۔ حامد۔ رضا۔ اختر مخمور ہیں۔ رضا میز پر ہاتھ ٹکا کر اُٹھتے ہوئے کہتا ہے:۔

رضا۔ ع برخیز کہ لغزیدن پا ہم مزہ دارد
اُٹھو۔ نشہ کی چال میں ایک خاص لطف ہے۔

حامد۔ کہاں چلیں؟

رضا۔ ہمارے گھر۔

اختر۔ وہاں پینے کو مل جائے گی؟

رضا۔ گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں۔

یہ سب کلب کے بڑے کمرے میں سے گزرتے ہیں، بوئے واؤچر پیش کرتا ہے، رضا دستخط کر دیتا ہے، باہر نکل کر رضا موٹر ڈرائیور کے برابر بیٹھتا ہے اور حامد و اختر پیچھے۔

ڈرائیور۔ کہاں حضور؟

رضا۔ گھر۔

موٹر چلتی ہے۔ اختر نشہ کی حالت میں گانا شروع کر دیتا ہے۔

مطربِ خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بنو
شاہدِ دلستاں بجو تازہ بتازہ نو بنو
با صنمے چو لعبتے خوش بنشیں بخلوتے
بوسہ ستاں بکام از و تازہ بتازہ نو بنو
شاہدِ دلربائے من میکند از برائے من
نقش و نگار و رنگ و بو تازہ بتازہ نو بنو
بادِ صبا چو بگذری بر سر کوئے آں پری
قصۂ حافظش بگو تازہ بتازہ نو بنو

تازہ بتازہ نو بنو سب مل کر گاتے ہیں۔
ڈرائیور گھر کے دروازہ پر موٹر روک دیتا ہے، یہ سب اتر کر کوریڈور Corridor میں سے گزرتے ہیں، بیرہ سامنے آتا ہے۔

رضا۔ بیگم صاحب سے بولو۔ ہم سب کھانا یہیں کھائیں گے۔

بیرہ۔ بیگم صاحب تو باہر تشریف لے گئی ہیں۔

رضا۔ اچھا۔ تم ٹریس (Terrace) پر کرسیاں لگاؤ۔ اور کچھ پینے کو لاؤ۔

بیرہ۔ جو حکم حضور۔

اب یہ سب ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں۔ رضا کو میز پر بیوی کے ہاتھ کا لفافہ نظر آتا ہے، اٹھا کر پڑھتا ہے اور چکرا کر گرتا ہے۔ اختر اور حامد پہلے رضا کو سنبھالتے ہیں پھر حامد گھنٹی بجاتا ہے، اختر خط زمین سے اٹھا کر پڑھتا ہے۔

حامد۔ (اونچی آواز میں) رضا۔ رضا۔

اختر حامد کو خط دیتا ہے، حامد پڑھ کر جیب میں رکھ لیتا ہے، بوئے داخل ہوتا ہے، رضا کو زمین پر پڑا دیکھ کر گھبراتا ہے۔

بیرہ۔ صاحب کو کیا ہوا حضور؟

اختر۔ کچھ نہیں۔ ذرا طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ دیکھو۔ وہ سوفا کھڑکی کے سامنے کرو۔

بیرہ سوفا سرکاتا ہے، اختر اور حامد بوئے کی مدد سے رضا کو اٹھا کر سوفے پر لٹا دیتے ہیں۔

اختر۔ دیکھو بیرہ۔ صاحب کا جوتا کھولو۔

اختر ٹائی کالر کھولتا ہے۔

حامد۔ میں ڈاکٹر رگھوناتھ کو ٹیلیفون کرتا ہوں۔

حامد دوسرے کمرے میں جاتا ہے، یہاں بیرہ اور اختر مصنوعی تنفس جاری کرنے کے لئے رضا کے ہاتھوں اور پیروں کی مالش شروع کرتے ہیں۔ حامد واپس آتا ہے۔

اختر۔ ڈاکٹر مل گیا؟

حامد۔ ابھی آتا ہے۔

حامد رضا کے قریب کرسی لے کر بیٹھ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ رومال سے ہوا دینے لگتا ہے۔

بہرہ۔ (باہر سے آ کر) ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔

حامد دروازہ کھول کر کھڑا ہوتا ہے ڈاکٹر اندر آتا ہے اور مریض کا معائنہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ڈاکٹر۔ بیہوش ہوئے کتنی دیر ہوئی؟

اختر۔ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ۔

ڈاکٹر۔ (سرنج میں انجکشن کی دوا بھرتے ہوئے) شراب پی ہے اور کوئی بڑا اشوک (Shock) ہوا ہے۔

اختر۔ ہاں۔

ڈاکٹر۔ کیا اصل بات آپ کو نہیں معلوم؟

اختر۔ معلوم ہے پر وہ ایک دوست کا راز ہے جو اس کی اجازت بغیر نہیں بتایا جا سکتا۔

ڈاکٹر رضا کے قریب آ کر بانہہ پر سے شرٹ ہٹاتا اور انجکشن دیتا ہے۔ پھر مریض کی نبض دیکھتا ہے۔ بیگ میں سے کاغذ اور قلم نکال کر نسخہ لکھتا ہے۔

اختر۔ کوئی اندیشہ تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ فی الحال تو کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے یہ نسخہ منگوا لیجیے۔ ایک دوا سنگھانے کی ہوگی وہ صاف رومال پر چھڑک کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد سنگھائیے۔ دوسری گولیاں ہوں گی۔ ان میں سے دو ہوش آ جانے پر پانی سے کھلا دیجیے گا اور اگر گھنٹہ بھر کے اندر ہوش نہ آئے تو مجھے ٹیلیفون کیجیے گا۔

ڈاکٹر باہر جاتا ہے۔ چلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر نبض دیکھتا ہے۔ حامد ڈاکٹر کے ساتھ باہر جاتا ہے۔

اختر۔ (بہرہ کو نسخہ دیتے ہوئے) موٹر لے کر ابھی جاؤ اور یہ نسخہ لے کر آؤ۔

حامد داخل ہوتا ہے اور رضا کے قریب بیٹھ کر اختر سے کہتا ہے۔

حامد۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ شراب کی زیادتی نے رضا کا دل بہت کمزور کر دیا ہے۔

اختر۔ یار یہ ہے بُری چیز۔

حامد۔ اُم الخبائث۔ دنیا بھر کی بُرائیاں اس کم بخت سے پیدا ہوتی ہیں۔ ع

ہزاروں بہ گئے ان بوتلوں کے بند پانی میں

ے الاماں مانگی ہے اس سے کرۂ ناری نے
لاکھوں گھر پھونک دیئے ہیں اسی چنگاری نے

بہرہ دوا لے کر آتا ہے۔ اختر شیشی کھول آستین سے رومال نکال اس پر چھڑکتا اور رضا کی ناک کے قریب لے جاتا ہے۔ رضا ذرا کلبلاتا ہے۔

بہرہ باہر چلا جاتا ہے۔

اختر۔ (حامد سے) وہ خط کہاں ہے؟

حامد جیب کی طرف آنکھ اور ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔

اختر۔ (بہت آہستہ آواز میں) تم نے ڈاکٹر سے اس واقعہ کا تو کوئی ذکر نہیں کیا؟

حامد۔ نہیں۔ میں کوئی پاگل ہوں۔ (رضا کی طرف اشارہ کرکے) اس کی طبیعت کو جانتے ہوئے میں ایسی غلطی کر سکتا تھا؟ اس کو تو یہ بھی شاق گزرے گا کہ یہ بات ہم پر کیوں ظاہر ہوئی۔ میں نے ایسا خوددار آدمی نہیں دیکھا۔

اختر برابر دوا سونگھا رہا ہے۔ رضا آہستہ آہستہ ہوش میں آتا ہے۔ حامد کی طرف دیکھتا اور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ حامد ہاتھ سے خوش لیٹے رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ اختر گھنٹی بجاتا ہے۔ بہرہ آتا ہے۔

اختر۔ (بہرہ سے) گولیوں کی شیشی اور ایک گلاس پانی لاؤ۔ (رضا سے) ڈاکٹر رگھوناتھ دوا تجویز کر گئے ہیں۔

بہرہ دونوں چیزیں ایک ٹرے میں رکھ کر لاتا ہے۔ حامد رضا کو سہارا دے کر اٹھاتا۔ اور دو گولیاں کھلا دیتا ہے۔ رضا کھوئے ہوئے انداز میں اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ پھر کمرے کے فرش کی طرف نظر دوڑا کر حامد کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔

رضا۔ وہ خط کہاں ہے؟

حامد۔ میرے پاس ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔

رضا۔ (بہت آہستہ) اسے جلا دو۔

حامد۔ اچھا جلا دوں گا۔

رضا۔ ابھی جلا دو۔ میں اسے جلتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔

حامد جیب میں سے وہ خط اور دیا سلائی کا بکس نکالتا ہے۔

رضا۔ (خط کو دیکھ کر) ع

کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

حامد خط کے ایک کونے کو دیا سلائی دکھاتا ہے۔

رضا جلتے ہوئے خط کو دیکھ کر:-

رضا۔ ہم سب اسی طرح جل رہے اور ختم ہو رہے ہیں پر جانتے نہیں۔ ؎

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب راز ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

اختر۔ رضا تم کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

رضا۔ (مسکرا کر) اختر بھائی۔ مانا کہ میرا دل خراب ہوگیا ہے پر خدا کا شکر ہے ابھی دماغ خراب نہیں ہوا ہے (حامد کی طرف دیکھ کر) دیکھو حامد! ریاض کا پتہ میری ڈائری میں لکھا ہے اس کو تار دو کہ فوراً چلا آئے۔ مجھے اس سے کچھ کہنا ہے۔

حامد۔ ریاض کو صبح تار دے دوں گا۔ اب تم آرام کرو۔

رضا۔ (مسکرا کر) آرام تو ہم کریں ہی گے۔ (ذرا سنجیدگی سے گردن ہلا کر) پہلے کام کرلیں۔ ریاض کو تار دو کہ فوراً چلا آئے ؎

اجل لگائے ہوئے گھات ہر کسی پر ہے
بہوش باش کہ عالم رواروی پر ہے

حامد۔ اچھا میں ریاض کو تار دلواتا ہوں۔ تم چپکے لیٹے رہو۔ زیادہ باتیں کرنا تمہیں مضر ہے۔

رضا۔ جو حکم۔

حامد چلا جاتا ہے۔ رضا کی آنکھ بے وفا ہیم کی تصویر پر پڑتی ہے۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔ نظر وہاں جم کر رہ جاتی ہے۔ اختر بھی اُدھر مُڑ کر دیکھتا ہے۔

رضا۔ (اختر سے تصویر کی طرف اشارہ کرکے) اس کو یہاں لاؤ۔

اختر تصویر اُتار کر لاتا ہے۔ رضا اس کے ہاتھ سے لے کر کہتا ہے۔

رضا۔ ایک اور میرے بیڈ روم میں ہے وہ بھی لے آؤ۔

اختر جاتا ہے۔ رضا تصویر فریم میں سے نکالتا ہے۔ اختر دوسری تصویر لئے واپس آتا ہے۔

رضا۔ شمع منگاؤ۔

اختر گھنٹی بجاتا ہے۔ بہرہ آتا ہے۔

اختر۔ (بہرہ سے) ایک شمع کی بتی لاؤ۔

رضا دوسرے فریم میں سے تصویر نکالتا ہے چہرہ پر ایک خاص طرح کی مُسکراہٹ ہے
بہرہ شمع لاتا ہے۔

رضا۔ (اختر کو تصویریں دیتے ہوئے) اس خرمن سوز کو نذر آتش کردو۔

اختر شمع روشن کرتا ہے اور تصویر کے ایک کونہ کو اُس کی لَو پر رکھ دیتا ہے۔

رضا۔ (شمع کو دیکھتے ہوئے گردن ہلا کر) ؎

بدگمانی جو ہوئی بزم میں پروانے کو
شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو

بزمِ جہاں سے وہ شمعیں ختم ہوگئیں جو پروانہ کی بدگمانی

رفع کرنے سر پہ آگ کھکر کھڑی ہو جاتی تھیں ہمارے دلیں کی وہ شمعیں سدھار گئیں جو ستی کی آگ میں جل مرتی تھیں۔ (دوسری تصویر اختر کو دیتے ہوئے) اب تو یہ کھوٹا مال رہ گیا ہے۔

جب دونوں تصویریں جل چکتی ہیں تو کہتا ہے

رضا۔ ہمیں پانی پلا دو۔

اختر صراحی میں سے پانی الٹ کر دیتا ہے۔ رضا کو سہارا دے کر اٹھاتا ہے۔ رضا پانی پی کر سیدھی کروٹ پر لیٹ جاتا ہے۔

اختر۔ اب تم ذرا دیر سو جاؤ۔

رضا۔ اچھا کوشش کرتا ہوں۔ ؎
دے لے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

سین (۴۱)

بیڈ روم:۔ رضا بیڈ روم میں پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھا ہے۔ ریاض اس کے قریب ایک گلاس میں دوا لئے کھڑا ہے۔

رضا۔ بیٹا اب دوا سے کوئی فائدہ نہیں خیر تمہاری ضد ہے۔ میں پئے لیتا ہوں (دوا پینے کے بعد) یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اب جانبر نہیں ہو سکونگا اور سچ یہ ہے کہ اب جینے کی تمنا بھی نہیں۔

ریاض۔ (گلاس برابر کی میز پر رکھ دیتا ہے) آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے آپ رنج نہ کیجئے۔ دل پر بوجھ نہ آنے دیجئے۔

رضا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں رنج نہ کرو۔ رنج جان کا لیوا۔ اور رنج جان کے ساتھ۔ ؎
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غم دم کے ساتھ ہے۔ اب اس سے جیتے جی چھٹکارا نہیں۔

ریاض بیٹا! دنیا میں عزت سے جینے کا عادی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کبھی کسی موقعہ پر تیرا باپ ذلیل نہیں ہوا۔ ہاں اب آخری وقت میں نام پر ایک ایسا دھبہ لگ گیا کہ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اب میرا پردہ ڈھک جائے تو بہتر۔

ریاض۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

رضا۔ میں نے تم کو سمجھانے ہی کے واسطے بلایا ہے۔ اور ہاں۔ آخری دفعہ صورت دیکھنے کو بھی دل چاہتا تھا۔ ریاض۔ تم میری اکلوتی اولاد ہو۔ میری ہر چیز کے تم وارث ہو۔ روپیہ۔ پیسہ۔ دولت ثروت یہ سب کچھ میرے بعد تمہارا ہے۔ ریاض۔ یہ چیزیں آتی جاتی ہیں۔ ہاں یاد رکھو۔ تم اس عزت کے بھی

وارث ہو جو تمہارے بزرگوں نے پیدا کی اور جسے میں نے بہت حفاظت سے رکھا۔ ہاں جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ لیکن آخری وقت میں قسمت کی خرابی سے میری عقل پر پتھر پڑ گئے اور اس آبگینہ میں بال پڑ گیا۔ دھبہ آ گیا۔ میرے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے پر وہ دھبہ بہت کچھ صاف ہو جائے گا۔ لیکن پوری طرح اس وقت صاف ہو گا جب اس آلودہ دامنی کی شریک کے خون سے دھویا جائے سنو۔ بیٹا! اپنے گنہگار باپ کے گناہ کا افسانہ سنو۔

تقریباً ۷ سال کا عرصہ ہوئے آیا ۱۹۳۶ء کے کرسمس میں نیو ایر ایو کے موقعہ پر میں تنہا کلکتہ کے ایک رسٹوران میں بیٹھا تھا۔ (Dissolve)

خیالات

رضا ایک عالیشان بال روم میں بیٹھا کچھ پی رہا ہے۔ سامنے کی میز پر روز اکیلی بیٹھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی جانب دو چار مرتبہ دیکھتے ہیں اور کسٹرا دو ولٹز بجانا شروع کرتا ہے اکثر لوگ فلور پر جاتے ہیں۔ رضا اپنی میز پر سے اٹھکر روز کے قریب جاتا ہے اور خاص طریقے سے جھک کر کہتا ہے

.? May رو ز کھڑی ہو جاتی ہے اور یہ دونوں ناچنے لگتے ہیں۔

(Redissolve)

پھر وہی کمرہ۔ باپ بیٹے سے باتیں کر رہا ہے۔

رضا۔ بیٹا۔ اس کا جادو مجھ پر کچھ ایسا چل گیا کہ تمہاری محبت بھی دل سے کم ہونے لگی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری گناہ کی زندگی تم دیکھو اس لیے تم کو یورپ بھیج دیا اور میں اس کے ساتھ کھلے ڈُلے رہنے لگا۔ (کچھ دیر رُک کر) بیٹا۔ عفوِ خطا ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ بدخواہوں نے ہمارے ساتھ برائیاں کیں۔ ہم نے سدا انکو معاف کیا۔ ہماری خاندانی تاریخ بتاتی ہے کہ حریفوں نے میدانِ جنگ میں ہم پر حملے کیے۔ وار کیے۔ ہمارے زخم لگائے۔ پر جب مغلوب ہو کر سامنے آئے۔ تمہارے بزرگوں نے ان کی خطا سے چشم پوشی اور ان کی غلطی سے درگذر کی۔ رزم و بزم میں مقابل آ کر اور پس پشت دشمنوں نے ہم کو گزند پہنچانی چاہی۔ پر جب شرمسار ہوئے معاف کر دیے گئے۔ دشمنوں نے ہماری جان پر ہاتھ ڈالا اور ہم نے ان کی جان بخشی کی لیکن آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو گا کہ کوئی

ہماری عزت پر حملہ کرے اور کیفرِ کردار کو نہ پہنچے۔
اس ناگن نے ہماری عزت پر ڈنک مارا ہے
اس کا بدلہ لینا تمہارا فرض ہے۔ میں کچھ دن کا
مہمان ہوں۔ یہ کام تم کو انجام دینا پڑے گا۔

ریاض۔ میں نے اس کو دیکھا نہیں پہچانوں گا
کیونکر؟ کوئی تصویر ہو تو دیکھ لوں۔

رضا۔ اس کی تصویر میں نے ختم کر دی۔ اس کو
ختم کرنا تمہارا کام ہے۔ پدر نتواند پسر تمام کند۔
(کچھ سوچ کر۔ تیوری پر ہلکا سا بل ڈال کر) ہاں اسکی
ایک خاص پہچان ہے۔

ریاض۔ وہ کیا؟

رضا۔ اس ناگن کے دائیں شانہ پر بچھو گدا ہوا ہے۔

رضا اتنا کہہ کر خموش ہو جاتا ہے، مے کا خیال
اس کے سامنے آتا ہے۔ رضا دیوانہ وار اس کو
دیکھتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مڑتی ہے۔ بچھو
گدا ہوا نظر آتا ہے۔

رضا۔ (بیتابانہ انداز میں) وہ رہا نیشِ عقرب۔
بزرگوں کی عزت تم کو سونپتا ہوں۔ یہ کام تمہارے
سپرد کرتا ہوں۔ یاد رکھنا۔ یہ تمہارے باپ کی
آخری وصیّت ہے۔

قریب ہی ایک فقیر گا رہا ہے۔

فقیر۔ ہر وقتِ نزع گناہوں سے توبہ کرلے داغ
کہ روسیاہ ابھی اختیار باقی ہے

رضا۔ (گردن ہلا کر) کہ روسیاہ ابھی اختیار باقی ہے
ریاض! تم گواہ رہنا کہ میں اپنے گناہوں پر نادم
ہوں اور سچے دل سے توبہ کرتا ہوں۔ وہ بخشنے والا
پروردگار ہے۔

فقیر گاتا ہوا گزر جاتا ہے۔ رضا بستر پر
بے سکت ہو کر پڑ جاتا ہے۔

سین (۵)

پہاڑ پر ہوٹل کا کمرہ۔ شام کا وقت۔
روز ٹینس کے کپڑے پہنے تیار کھڑی ہے،
یوسف ڈریسنگ روم میں شرٹ پہن رہا
ہے۔ روز بے چینی کے ساتھ گھڑی دیکھ
کر کہتی ہے:۔

روز۔ میں کورٹس پر جا رہی ہوں۔ تم آجانا۔

یوسف۔ (شرٹ کے بٹن لگاتے ہوئے) All right۔
تم۔ جاؤ۔ میں آتا ہوں۔

روز ٹینس کورٹس پر ریکٹ ہلاتی ہوئی پہنچتی
ہے۔ ایک کورٹ پر کھیل ہو رہا ہے۔ ایک
نوجوان بنچ پر پارٹنر کا منتظر بیٹھا ہے۔ روز کے
آتے ہی اس کے پاس جا کر کہتا ہے:۔

نوجوان۔ would you like to play
آئیے ادھر ہم شروع کریں۔

روز۔ Alright ۔ برابر

یہ دونوں کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ یوسف آتا ہے اور ایک طرف بنچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک اور شخص آتا ہے۔ یوسف اس کے ساتھ تیسرے کورٹ پر کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ روز تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد اپنے سامنے والے نوجوان سے کہتی ہے۔

روز۔ میں تھک گئی۔

نوجوان۔ آئیے ذرا دوک (drinks) کر آئیں۔

روز۔ (ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے) اچھا۔

دونوں ساتھ جاتے ہیں۔ روز جب یوسف کے برابر سے گزرتی ہے تو کہتی چلی جاتی ہے:-

روز۔ یوسف ہم دوک کو جا رہے ہیں۔

یوسف اس کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ کسی قدر کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور پھر کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔

سین۔ (۶)

رات کے بارہ بجے ہیں۔ ہوٹل کے کمرے میں یوسف سلیپنگ سوٹ پہنے کرسی پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا ہے لیکن کچھ بے چین سا ہے۔ اٹھتا ہے۔ اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے۔ دروازہ کھولکر باہر منہ نکال کر دیکھتا ہے۔ پھر بیٹھ جاتا ہے
روز ہاتھ میں ریکٹ لئے قدرے نشہ میں کمرے میں آتی ہے۔

یوسف۔ (روز کی طرف دیکھ کر) آپ تشریف لے آئیں؟

روز۔ o yes او یس

یوسف۔ (ریکٹ کو دیکھ کر) کھیل ختم ہو گیا؟

روز۔ (ریکٹ کو کور میں بند کرتے ہوئے ہنس کر) دنیا ایک کھیل ہے۔

ریکٹ کو پریس میں لگاتے ہوئے گاتی ہے

دُنیا کھیل تماشا لوگو دُنیا کھیل تماشا
نس دن نیا کھلاڑی بابا نس دن نیا تماشا
دُنیا کھیل تماشا لوگو دُنیا کھیل تماشا

روز گاتے گاتے پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے

روز۔ (یوسف کی طرف دیکھ کر) ہلو! تم منہ پھلائے کیوں بیٹھے ہو؟

یوسف۔ (روز کے پاس آکر) دیکھو روز! مجھ کو یہ باتیں پسند نہیں۔

روز۔ (بگڑ کر) کیا باتیں؟

یوسف۔ تمہارا اس طرح دوسروں کے ساتھ

فری ہونا۔ بغیر میری اجازت کے اجنبیوں کے ساتھ چلا جانا۔

روز۔ (آنکھیں چڑھاکر) ۔ Oh really تم کو ہماری یہ باتیں پسند نہیں؟ تو ہم کو تمہارا (منہ چڑھاکر) ایسا منہ پسند نہیں۔ ہم آزاد ہے۔ تمہارا بیوی نہیں ہے۔ ایسا زور کسی ہندوستانی عورت پر چلے گا۔ ہم پر نہیں۔

یوسف۔ میں اس حالت میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

روز۔ Thank you جیسی تمہاری خوشی۔

پلنگ پر سے اٹھ کر ڈریسنگ روم کی طرف گاتی چلی جاتی ہے۔

دنیا کھیل تماشہ لوگو دنیا کھیل تماشا

تس دن نیا کھلاڑی بابا نسدن نیا تماشا

یوسف۔ نیا کھلاڑی مل گیا۔ پرانے کو دھتا بتائی۔ یہ عورتیں کسی کی ہوکر نہیں رہتیں۔ نسدن نیا کھلاڑی۔

اندر سے گانے کی آواز آرہی ہے "دنیا کھیل....."

سین (۷)

صبح کا وقت ہے۔ ریاض اپنے کمرے میں بیٹھا سوٹ کیس بند کر رہا ہے۔ نوکر ایک کارڈ ٹرے پر پیش کرتا ہے۔

ریاض۔ (کارڈ دیکھ کر) بلالو۔

حامد کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ ریاض تعظیم دیتا ہے۔

حامد۔ (سوٹ کیسز کی طرف دیکھ کر) میاں! کہاں جارہے ہو؟

ریاض۔ کچھ دن کے لئے مسوری جارہا ہوں۔ یہاں گرمی سخت ہے۔ اور.......... والد بغیر گھر کاٹے کھاتا ہے۔

حامد۔ اچھا ہے۔ کچھ دن باہر رہ لو۔ دل بہل جائے گا۔

سین (۸)

ہوٹل کا کمرہ۔ صبح کا وقت۔ یوسف اپنا سامان سوٹ کیسز میں بند کر رہا ہے۔ گھنٹی بجاتا ہے۔ بوئے آتا ہے۔

یوسف۔ (بوئے سے) دیکھو یہ سامان سنی ہو جائے گا۔

بوئے ایک ایک چیز اٹھا کر باہر لے جاتا ہے یوسف سگرٹ کیس نکالتا ہے۔ روز ڈریسنگ روم میں سے شرٹ اور بریچز پہنے ہوئے آتی ہے۔ ہاتھ میں رائڈنگ وپ ہے۔ لکھنے کی میز جو کھڑکی کے پاس رکھی ہے اس پر دو پگ

سر اٹکا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یوسف سگرٹ نہیں پر سگرٹ ٹھونک رہا ہے۔ روز یوسف کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہتی ہے۔

روز۔ اچھا تو تم جا رہے ہو ؟

یوسف۔ یس۔ Yes

روز۔ آج تک کا ہوٹل کا بل دیتے جانا۔

یوسف۔ (گھنٹی بجاتا ہے، بوئے آتا ہے) تم اب تک دفتر سے بل نہیں لائے ؟

بوئے۔ بل بن رہا ہے حضور۔ ابھی لایا۔

بوئے چلا جاتا ہے۔ روز کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہتی ہے۔

روز۔ تم لوگ عورت کو اپنا نوکر سمجھتے ہو۔ یہ بات غلط ہے۔ اس ملک کی عورتوں نے مردوں کی عادتیں خراب کر دی ہیں .... (ذرا ادھر اُدھر ٹہل کر) یہ عورتیں انسان نہیں ہوتیں جانور ہوتی ہیں جانور۔

یوسف جواب تک بے اعتنائی سے سن رہا تھا ان الفاظ پر افروختہ خاطر ہو جاتا ہے۔ اور روز کی طرف بڑھتے ہوئے کہتا ہے۔

یوسف۔ جانور ؟ جانور تم ہو۔ تمہاری حیثیت بھاڑے کے ٹٹو سے زیادہ نہیں۔ تم ہو جانور جو ایک کی ہو کر نہیں رہ سکتیں۔ نیک اور شریف عورتیں گھروں کی ملکہ ہوتی ہیں۔ دیویاں ہوتی ہیں ہم ان کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے چرن لیتی ہیں۔ تمہاری طرح ہرجائی نہیں کہ جہاں دیکھا توا پرات وہیں گزاری ساری رات ٹینس کی گیند کبھی اس کے ہاتھ کبھی اس کے ہاتھ نس دن نیا کھلاڑی۔ بس دن نیا کھلاڑی۔

روز کچھ جواب دینے کو ہوتی ہے کہ بوئے باہر سے ناک کرتا ہے۔

یوسف۔ کم ان۔ (Come in)

بوئے ٹرے پر بل پیش کرتا ہے۔ یوسف بل لے کر ہپ پوکٹ میں سے بٹوا نکالتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔ بوئے پیچھے پیچھے ہے۔

سین (۹)

رات کے نو بجے ہیں۔ ایک بہت بڑا بال روم ہے۔ لوگ میزوں پر بیٹھے کھا پی رہے ہیں۔ بوئے چاروں طرف پھر رہے ہیں۔ ریاض بھی ایک میز پر بیٹھا کچھ پی رہا ہے۔ روز سامنے آتی ہے۔ ریاض سے آنکھیں چار ہوتی ہیں اٹھلاتی ہوئی اس کے سامنے والی خالی میز پر بیٹھ جاتی ہے۔ بوئے آتا ہے۔ کوک ٹیل آرڈر کرتی ہے۔

بیچ ہال میں اناؤنسر آ کر کہتا ہے۔

اناؤنسر۔ اب آپ لوگ مالن کا گیت سُنیں گے۔

باجہ بجنا شروع ہوتا ہے۔ ایک عورت مالنوں کے کپڑے پہنے۔ سر پہ نازک سی ٹوکری رکھے بیچ ہال میں آتی ہے۔ تھوڑا ناچتی ہے۔ جیسے ترکاری توڑ رہی ہو۔ پھر گانا شروع کرتی ہے۔

گانا:۔ ترکاری لے لو مالن تو آئی بیکانیر سے۔
ترکاری لے لو۔

مالن ٹوکری سامنے رکھ کر ہو بیٹھتی ہے اور دُکان سی لگا لیتی ہے۔ ایک چھوٹی سی ترازو بھی سامنے رکھ لیتی ہے۔

گانا

سویا بیچوں پالک بیچوں اور بیچوں چولائی
بھرے بزار میں ڈنڈی ماروں تو مالن کی جائی بے ترکاری لیلو
بزم جہاں میں آ کر ہر دم میری زباں پہ جاری ہے
لائی ہوں میں دور سے ترکاری یہ سرکاری ہے۔ ترکاری لیلو
بیچتی ہوں جو خریدے مرے ارماں کوئی
مفت دیتی ہوں اگر ہاں لے احسان کوئی۔ ترکاری لیلو
لختے بُرد از دل گزرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروشِ دل صد پارۂ خویشم۔ ترکاری لیلو
سویا بیچوں پالک بیچوں اور بیچوں چولائی
بھرے بزار میں ڈنڈی ماروں تو مالن کی جائی بے ترکاری لیلو
نین چھپائے نا چھپیں پٹ گھونگٹ کی اوٹ
چتر نار اور سور ما کریں لاکھ میں چوٹ۔ بھرے بزار میں...
ہجوم عام میں رخسارِ یار کے بوسے
مری نظر نے نگاہیں بچا بچا کے لئے.....
بھرے بجار میں ڈنڈی ماروں.....
گاجر کا میں قلعہ بناؤں مولی کا دروازہ
شکر قند کی توپ لگاؤں لڑیں فرنگی راجہ... ترکاری لیلو

مالن گا کر جاتی ہے اور بینڈ بجنا شروع ہوتا ہے وہی دو لٹز بجتا ہے جو کلکتہ کے رستوران میں بجا تھا۔ ریاض اُٹھ کر روز کے سامنے اسی طرح جھکتا ہے جس طرح اس کا باپ کبھی جھکا تھا۔ یہ دونوں ناچنے لگتے ہیں۔ پھر روز ریاض کی میز پر آن بیٹھتی ہے۔ سامنے میز پر سعید اور اس کی بہن شمیم اور شمیم کی سہیلی نسیم بیٹھی ہے۔

سعید۔ (ریاض کو غور سے دیکھ کر) یہ تو ریاض ہے میرا کلاس فیلو۔ (اُٹھ کر ریاض کی طرف جاتے ہوئے) میں ابھی آیا۔ (ریاض کی کرسی کے پاس کھڑے ہو کر) ہلو ریاض! تم مجھے نہیں پہچانے؟

ریاض۔ ہلو سعید۔ (اُٹھ کر ہاتھ ملاتا ہے)

سعید۔ تم اتنی جلدی چلے آئے۔ کیا لا (سمہ)

کہا

نہیں گیا؟

ریاض۔ کچھ ایسے ہی واقعات تھے مجھے جلدی آنا پڑا۔ (روز سے انٹرڈیوس کراتے ہوئے) مس روز ...... مائی فرینڈ مسٹر سعید۔ (روز اور سعید ہاتھ ملاتے ہیں۔

سعید۔ (ریاض اور روز سے) آیئے ہماری میز پر چل بیٹھئے۔

ریاض۔ (سعید کی میز کی طرف دیکھتے ہوئے) آپ کے ساتھ کون خواتین ہیں؟

سعید۔ میری بہن اور اس کی سہیلی۔

ریاض۔ (آنکھ سے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں بیٹھ جاؤ۔

سعید۔ (مسکرا کر) اچھا تو ان سے چلکر اجازت لے لو۔

ریاض روز سے اجازت لے کر سعید کے ہمراہ اسکی میز پر جاتا ہے۔

سعید۔ (شمیم اور نسیم سے تعارف کرواتے ہوئے) میری بہن شمیم اور ان کی کلاس فیلو مس نسیم۔ (ریاض کی طرف اشارہ کرکے) مائی فرینڈ مسٹر ریاض۔ ابھی ولایت سے آئے ہیں۔ لا پڑھنے گئے تھے۔ دلی کے بڑے رئیسوں میں ہیں۔

ریاض۔ (ہاتھ ملاتے ہوئے) دلی میں عمارتوں کے بھی کھنڈر ہیں اور (ذرا جھک کر) رئیسوں کے بھی

حکومت ہند نے پرانی عمارتوں کی حفاظت کے لئے ایک باقاعدہ محکمہ قائم کر رکھا ہے۔ لیکن پرانے خاندانوں کے کھنڈر اللہ داسی پڑے ہیں۔

شمیم۔ (ذرا مسکرا کر) ہم کب تک دوسروں کی حفاظت کے محتاج رہیں گے۔

ریاض۔ میں اس اصلاح کا شکریہ ادا کرتا ہوں کیا تھوڑی دیر کے لئے میں سعید کو اپنی میز پر لے جاسکتا ہوں؟

شمیم۔ بڑی خوشی سے۔

ریاض ذرا جھک کر سعید کو ساتھ لے اپنی میز پر چلا جاتا ہے۔

شمیم۔ (کانی بناتے ہوئے) ریاض یہ تو مس لو کے منگیتر کا نام تھا۔

نسیم۔ اور وہ بھی دلی کا رہنے والا تھا۔

شمیم۔ اور بیرسٹری کرنے ولایت گیا تھا۔ پر اس بات کو ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ یہ واپس کیسے آگئے؟

نسیم۔ آوارگی میں پڑ گئے ہوں گے۔ باپ نے واپس بلالیا ہوگا۔

شمیم۔ یہ فرق ہے مرد اور عورت میں۔ وہ غریب

ان کے نام پر بیٹھی ہے اور یہ (ریاض کی میز کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ نسیم کی طرف شوخ نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا رہا ہے) یہاں گلچھرے اڑا رہے ہیں۔
نسیم۔ مسز لوکو ان باتوں کی خبر ہے یا نہیں؟
شمیم۔ میں کہتی ہوں اس کو یہ سب حال لکھ کر بلا لیں۔ ملے ہوئے بھی مدتیں ہو گئی ہیں۔
نسیم۔ پہلے یہ تو پوری طرح معلوم کر لو کہ یہ ہیں بھی اس کے منگیتر یا نہیں۔ کبھی یوں ہی مفت خدا میں خود بھی پاگل بنیں اور اس غریب کو بھی پریشان کریں۔

ریاض کی میز پر

سعید۔ اچھا تو اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ اتوار کو آپ دونوں ہمارے ساتھ پک نک کو چلیں گے۔
ریاض۔ بے شک۔
سعید۔ (اپنی میز پر آ کر) چل رہی ہو؟
شمیم۔ ہاں۔
سعید۔ بوئے۔ (بوئے آتا ہے) بل لاؤ۔

بوئے پیٹی میں سے بل نکال کر ٹرے پہ رکھ کر پیش کرتا ہے۔ سعید دس کا نوٹ اس پر رکھتے ہوئے کہتا ہے۔

سعید۔ یو کیپ دی چینج۔ (You Keep The change)

یہ تینوں رسٹوران کے دروازہ میں سے باہر نکلتے ہیں۔ رکشا والے دوڑتے ہیں۔

سعید۔ رکشا میں چلو گی؟
نسیم۔ نہیں۔ مجھے یہ سواری ایک آن نہیں بھاتی۔
سعید۔ (رکشا والوں سے) نہیں یا تانگا (نسیم سے) آپ کو یہ سواری کیوں بُری معلوم ہوتی ہے؟
نسیم۔ میں سمجھتی ہوں بڈھے اور بیماروں کے واسطے تو یہ ٹھیک ہے۔ پر ہم جیسے ہٹے کٹے سنڈے مسٹنڈوں کے لئے رکشا میں بیٹھنا بڑے شرم کی بات ہے۔ غضب خدا کا۔ آدمی کو جانور کی طرح استعمال کرنا کس خدا نے بتایا ہے؟

یہ سب آہستہ آہستہ چلے جا رہے ہیں۔

نسیم۔ یہ نسیم آپ کے دوست کی بیوی تھی؟
سعید۔ نہیں! کیوں؟
نسیم۔ میں نے سمجھا بیرسٹر صاحب ہیں شاید ولایت سے موکلہ ساتھ لائے ہوں۔
سعید۔ نہیں موکلہ نہیں ہیں اور نہ ریاض لا کا امتحان دے سکا۔ کچھ خاندانی وجوہ سے واپس آنا پڑا۔

شمیم نسیم کی طرف خاص انداز سے دیکھتی ہے۔
یہ سب کہار بیگ پر اپنی کوٹھی میں داخل ہوتے ہیں نسیم اور شمیم ایک بیڈ روم میں چلی جاتی ہیں۔

شمیم سنگار میز کے سامنے کھڑی بندے اتار رہی ہے اور نسیم پلنگ کی پٹی پر بیٹھی جوتے کا اسٹریپ ڈھیلا کر رہی ہے۔

نسیم۔ اب تو تمہارا اطمینان ہو گیا کہ یہ نئے چھیلا مہ نو کے منگیتر ہیں۔

شمیم۔ بس تو صبح ہی اس کو خط بھیجتی ہوں اور سارا کچا چٹھا لکھے دیتی ہوں۔

سین (۱۰)

صبح کے وقت نسیم اور شمیم دونوں سلیپنگ سوٹ پہنے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی ہیں سامنے ایک چھوٹی سی میز پہ چاء رکھی ہے۔

شمیم۔ (اٹھ کر) اچھا تو میں خط لکھ دوں؟

سنگار میز کی طرف جاتی ہے۔

نسیم۔ پیڈ اور پین سیدھے ہاتھ کے خانے میں ہیں۔

شمیم یہ چیزیں لے کر نسیم کے قریب جا بیٹھتی ہے۔

شمیم۔ کیا لکھوں؟

نسیم۔ یہی لکھ دو کہ تمہارے منگیتر یہاں گلچھرے اڑا رہے ہیں اور تم خواب خرگوش میں ہو۔

شمیم۔ باولی ہوئی ہے۔ ایسی بات طریقے سے کہی جاتی ہے۔

نسیم۔ ہم طریقہ وریقہ نہیں جانتے خواہ مخواہ کا تکلف۔

شمیم۔ جو تیرا منگیتر ایسا ہوتا تو تجھے صاف صاف لکھ دیتی۔

نسیم۔ جو میرا منگیتر ایسا ہوتا تو میاں جی کو مزہ چکھا دیتی۔ وہ ایک کے ساتھ پھرتا تو میں دوسرے کے ساتھ جاتی۔

شمیم۔ سچ ہے۔ تو کرے گا رام جنی تو میں کروں گی رام جنا۔

نسیم۔ بے شک۔ میں تو مثل کو اصل کر دکھاتی۔

شمیم۔ جب ہی تو تجھے کوئی جڑا نہیں۔

نسیم۔ بس چپکی بیٹھی رہ۔ جڑا نہیں۔ اب بھی سینکڑوں ہاتھ جوڑتے آتے ہیں۔

شمیم۔ (آنکھیں پھاڑ کر) سچ!

نسیم۔ سچ نہیں تو کیا جھوٹ۔

شمیم۔ تو دروازے پر خیر سے بھیڑ لگی رہتی ہوگی۔ ع

عشاق کا جمگھٹ ہے تو جانبازوں کا میلہ

نسیم۔ مجھے مرد کی ذات سے نفرت ہے۔ بس چلے تو سب کو قتل کر دوں۔ بے ایمان۔ دغاباز ہرجائی۔

شمیم۔ بات تو سچ ہے اچھا اب یہ بتا اس مہ نو

کو کیا لکھوں؟

نسیم۔ کہہ تو دیا لکھ دے۔ پنچھی ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ ولایتی چڑیا نے جال پھیلا دیا ہے۔ خط کو تار سمجھو۔ پہلی ٹرین سے فوراً چلی آؤ۔ نہیں تو پچھتانا پڑیگا۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔

شمیم۔ تو تو دیوانی ہے۔ کیا غریب کا ہارٹ فیل کرنا ہے۔ جو اس طرح لکھوں۔

نسیم۔ تو ہم سے کیوں پوچھتی ہے جس طرح تیرا دل چاہے اس طرح لکھ۔

یہ کہہ کر اُٹھ جاتی ہے اور اٹھلاتی ہوئی سنگار میز پر جا بیٹھتی ہے۔ بال بناتی ہے اور گاتی جاتی ہے۔

گانا

تو جو ہرجائی ہے اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی
کسی ایک گل کے بلبل بنتے نہیں چمن میں
ہر اک سے دوستی ہے دستور انجمن میں
تو جو ہرجائی ہے......

شمیم۔ (خط بند کرتے ہوئے) ایک پہ مرنا ایک پہ جینا ایک ہی اپنا سجنا ہے۔ ایک پہ مرنا...
پروانے جل اُٹھے تھے کچھ ایسی لو لگی تھی
اک شمع جل رہی تھی دیکھا تو انجمن میں..... ایک پہ مرنا
وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو... ایک پہ مرنا
ہمچو ہندو زن کسے در عاشقی مردانہ نیست
سوختن بر شمع کشتہ کار ہر پروانہ نیست.... ایک پہ مرنا

شمیم پلنگ پر سے اُٹھکر نسیم کے قریب کرسی پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

شمیم۔ بیگم یہ سنگار ختم بھی ہوگا یا نہیں؟

نسیم۔ (بہت انہماک سے بالوں کو خوشۂ انگور کی شکل میں کانوں کے پیچھے بناتے ہوئے) چپکی رہ۔ بڑی مشکل سے قابو میں آئے ہیں۔ ٹھیک ہیں نا؟

شمیم۔ (سامنے کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور گاتی ہے):۔

تورے ناگن سے کاکل ڈس گیوری.......
تورے ناگن سے کاکل.........
ز خلوت گاہِ سوزِ اندروں دودے بروں آمد
بہ تائیدِ صبا گردِ رخش گردید و کاکل شد.....
ڈس گیوری۔ تورے.........
رات کو خواب میں زلفیں تری برہم دیکھیں
ظاہرا جس کی نظر آتی ہیں تعبیریں دو
یا تو دو مارِ سیہ جان کے خواہاں ہونگے

یا جنوں پاؤں میں پہنائے گا زنجیریں دو
ڈس گیوری تورے ناگن سے کالی۔ ڈس گیوری۔

سین (۱۱)

صبح کا وقت۔ مہ لو سونے کے کمرے میں صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ ماما ٹرے پر خط پیش کرتی ہے۔ مہ لو دو چار خط سرسری طور پر دیکھ کر آرام پر رکھ لیتی ہے۔ اب ایک خط کھولتی ہے۔ مسکراتی ہے۔

مہ لو۔ (خط پڑھتے ہوئے) مسوری آجاؤ۔ مسوری آجاؤ۔ کیوں آجاؤ؟ ہم نہیں آتے۔ ہم دلی نہیں چھوڑتے (آگے خط پڑھتی ہے۔ پیشانی پر شکن ڈال کر) سُنا تو میں نے بھی تھا کہ وہ واپس آگئے ہیں۔

ڈائننگ روم میں مسٹر حمید مہ لو کے چچا ادھیڑ عمر کے آدمی میز پر بیٹھے ہیں۔ مہ لو کو آواز دے کر کہتے ہیں۔

حمید۔ ماما۔ بیٹی آئی کیوں نہیں؟

مہ لو۔ (خط بند کرتے ہوئے) آئی چچا جان۔

مہ لو ڈائننگ روم میں جاتی ہے اور کرسی پر بیٹھ کر نیپکن سامنے ڈال لیتی ہے۔ بیرہ دلیا پیش کرتا ہے۔

مہ لو۔ شمیم کا خط آیا ہے۔

حمید۔ اچھا۔

مہ لو۔ وہ آج کل مسوری میں ہے۔

حمید۔ ہوں۔

مہ لو۔ لکھتی ہے۔ وہاں موسم بہت اچھا ہے۔

حمید۔ خوب۔

مہ لو۔ ان لوگوں نے پوری کوٹھی کرایہ پر لے رکھی ہے۔

حمید۔ اچھا۔

مہ لو۔ مجھے بلاتی ہے۔

حمید۔ (مہ لو کی طرف دیکھ کر) شمیم کا خط آیا ہے۔ مسوری میں ہے۔ موسم بہت اچھا ہے وغیرہ وغیرہ صاف یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس نے بلایا ہے اور تمہارا جانے کو دل چاہتا ہے۔ بسم اللہ جاؤ میں کب منع کرتا ہوں۔ ہاں ہاں بیٹا۔ میں سمجھتا ہوں تم بیرسٹر بہت اچھی بنتیں۔ ہاں مجھے خوب یاد آیا۔ ریاض ولایت سے واپس آگیا ہے۔ رشا کے مرجانے کی وجہ سے اسکو جلدی آنا پڑا۔ میں ملا تھا۔ باپ کی موت سے کچھ پریشان سا معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں شادی بیاہ کا ذکر کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا۔

مہ نو سر جھکائے کھانا کھاتی رہتی ہے۔ جب حمید
باتیں کر چکتا ہے تو کہتی ہے۔

مہ نو۔ میں کل چلی جاؤں ؟

حمید۔ اچھی بات ہے۔ روپیہ تمہارے پاس ہے
یا میں بھیج دوں ؟

مہ نو۔ بینک سے لیٹر آف کریڈٹ لے جاؤں گی۔

سین (۱۲)

صبح کا وقت۔ بیڈ روم میں دو ڈریسنگ ٹیبل
رکھی ہیں۔ شمیم برجیز اور شرٹ پہنے ڈریسنگ
ٹیبل کے سامنے بیٹھی بالوں کو جما رہی ہے۔
نسیم ہائی بوٹ اور برجیز پہنے ایک پاؤں
کرسی پر رکھے کھڑی ہے۔ مہ نو دوسری
ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی سنگار کر رہی
ہے۔ نسیم مہ نو کی طرف شریر نظروں سے دیکھ کر
گاتی ہے اور آہستہ آہستہ رائڈنگ، وپ سے
تال دیتی جاتی ہے۔

نسیم۔ کرے سولہ سنگار۔ کون البیلے کی نار۔

مہ نو۔ (سنگار کرتے ہوئے) نہیں مانے گی تو؟ تیری
شامت آرہی ہے میرے ہاتھ سے۔

نسیم۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ تجھ سے بات کون کر رہا
ہے۔ جل ککڑی کہیں کی۔ (پھر گانا شروع کرتی ہے)

کون البیلے کی نار کرے سولہ سنگار..... کون البیلے کی نار

مہ نو کانوں میں بندے پہنتی ہے۔ پھر ہاتھوں میں
چوڑیاں ڈالتی ہے۔

نسیم۔ (مہ نو کی ہر حرکت کے ساتھ ساتھ گاتی جاتی ہے)
کانوں میں بندے۔ ہاتھوں میں چوڑیاں۔ کون
البیلے کی نار۔

مہ نو۔ (بگڑ کر بیٹھ جاتی ہے) ہم نہیں چلیں گے
تم لوگوں کے ساتھ۔

نسیم گائے جاتی ہے۔ شمیم مہ نو کی طرف
دیکھ کر کہتی ہے۔

شمیم۔ بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

نسیم مہ نو کے قریب آکر اس کی بلائیں لیتے ہوئے
کہتی ہے۔ مہ نو تیوری پر بل ڈال کر اس کا
ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔

نسیم۔ بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے
بلا یہ کون لیتا اپنے سر لیتے تو ہم لیتے
کرے سولہ سنگار کون البیلے کی نار

مہ نو کو ایک طرف سے شمیم اور ایک طرف سے نسیم
پکڑ کر کرسی پر سے اٹھاتی ہیں۔

مہ نو۔ ہم نہیں جائیں گے۔

نسیم ۔ (منو کا ہاتھ چھوڑ کر مُنہ چڑاتے ہوئے) ہم نہیں جائیں گے۔ من چاہے منڈیا ہلائے۔ دلّی سے تو یہاں تک بھاگی بھاگی آگئیں۔ اب بتوّ نخرے دکھا رہی ہیں۔ یہ انداز دکھانا (اشارہ کرکے) اپنے ان کو۔ چلتی ہو تو چلو نہیں تو یہیں پڑی رہو۔ ایسی ناز برداری کوئی اور کرے گا۔

شمیم ۔ بس چپکی رہ تو نے ہماری مانا کو خفا کر دیا۔ تیری للّو چلے ہی جاتی ہے۔ رُکتی نہیں۔ یاد رکھیو کسی دن کتر پھینکوں گی۔

شمیم ہاتھ پکڑ کر منو کو اُٹھاتی ہے۔

سین (۱۳)

کاسٹی فول۔ نسیم، شمیم اور مانا ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہیں۔ سامنے سے ریاض، سعید اور روز ٹہلتے ہوئے اُن کی طرف آ رہے ہیں۔ جب قریب آجاتے ہیں تو یہ تینوں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ریاض اور سعید جھکتے ہیں۔ روز مسکراتی ہے۔ نسیم ذرا آگے بڑھ کر مانا اور ریاض کا تعارف کراتے ہوئے کہتی ہے۔

نسیم ۔ مائی فرینڈ مسٹر ریاض۔ مائی فرینڈ مس

(نسیم فقرہ ختم کرنے نہیں پاتی جو شمیم اپنے جوتے کی ایڑی نسیم کی ٹو پر رکھ کر دبا دیتی ہے۔ وہ ہائے کرتی ہے۔ شمیم اس کی طرف توجہ نہیں کرتی۔ اور فقرہ پورا کرتی ہے)

شمیم ۔ مائی فرینڈ مس رعنا۔

مانا ریاض سے نیچی نظریں کرکے ہاتھ ملاتی ہے۔

ریاض ۔ (رعنا کو روز سے انٹرڈیوس کراتے ہوئے) مائی فرینڈ مس روز۔ مس رعنا۔ (مانا روز سے ہاتھ ملاتی ہے پر ذرا روکھے پن سے)

یہ سب بیٹھ جاتے ہیں۔ عورتیں تہ ہونے والی کرسیوں پر اور مرد زمین پر۔

سعید ۔ (ریاض سے) ریاض! اس وقت مجھ کو تمہاری منگنی کا جلسہ یاد آ رہا ہے جو دریا کنارے ہوا تھا۔

ریاض ۔ (کھوے اونچے کرکے) اونہ۔ وہ داستان پارینہ ہے۔

یہ الفاظ سن کر رعنا کے چہرہ پر ایک خاص اکسپرشن آتا ہے۔

سعید ۔ کیا مطلب؟

ریاض ۔ مطلب یہ کہ ہمارا ارادہ (ایک گول بٹیا زمین پر سے اٹھا کر) اس جیسا گول مٹھول بننے کا

نہیں ہے۔ اور ازدواجی زندگی کی قلابازیاں انسان کے تمام کونے گھس گھسا کر گول کر دیتی ہیں۔
رعنا۔ (آنکھیں نیچی کئے ہوئے) زندگی کے سیہاؤں میں آنے والے کو گول تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ وہ چاہے (تیز آبشار کی طرف اشارہ کرکے) ہوا و ہوس کے تیز و تند تھپیڑوں میں یا (آب رواں کی جانب اشارہ کرکے) پرسکون موجوں کے آغوش میں۔

شمیم اور نسیم ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہیں۔

سعید۔ واللہ رعنا بہن اس وقت تو تم نے ریاض کو لاجواب کر دیا۔ ایک فقرہ میں سارا فلسفۂ حیات بیان کر ڈالا۔ اس کو کہتے ہیں کوزہ میں دریا بند کرنا۔
رعنا۔ اب زیادہ مجھے بنائیے نہیں۔

سعید مسکرا کر چپ ہو جاتا ہے پھر ریاض سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

سعید۔ تو کیا تمہارا ارادہ شادی کا ہے ہی نہیں؟
ریاض۔ (سگرٹ کیس میں سے سگرٹ نکالتے ہوئے) بھئی بات یہ ہے کہ شادی کا ارادہ ہے یا نہیں۔ بہر صورت اس قسم کی شادی کے تو ہم کسی طرح قائل نہیں کہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ نہ ہم اُن سے واقف نہ وہ ہم کو جانیں۔ ماں باپ نے بات پکی کی ہم دولھا چکی چولھا بن ساتھ ہو لئے۔ قاضی جی نے رقم سیدھی کی۔ یار دوستوں نے مبارکبادیں پیش کر دیں لیجئے ساری عمر کے لئے ہم ایک دوسرے کے شریک زندگی قرار پا گئے۔ یہ شادی نہیں مذاق ہے۔ گاجر کی پینڈی گلیجڑو کے پھول۔ کیوں میاں گڈے تمہیں گڑیا قبول۔ سو صاحب نہ میں گڈا ہوں نہ ایسی بے جانی پہچانی گڑیا لانی چاہوں صاف بات ہے۔

اس گفت و شنید کے دوران میں نسیم اور شمیم چند بار رانا کو ٹہکتی ہیں اور وہ ان کا ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔

روز۔ او۔ بس۔ ریاض بالکل ٹھیک کہتا ہے بغیر ایک دوسرے کو اچھی طرح جانے شادی کرنا پاگل لوگوں کا کام ہے۔
مہ لو۔ اور روز نت نیا پرکھنا ہوشیاروں کا کام ہے۔ آج ایک کی جچائی کی بکل دوسرے کو پرکھا اور اگر کوئی پسند بھی آ گیا تو سال کے اندر اندر طلاق اور پھر وہی نئے کی تلاش۔ اگر ہوشیاری اسی کا نام ہے تو ہم پاگل ہی اچھے۔

یورپ کی ہوشیاری یورپ ہی کو مبارک رہے۔
روز۔ ہم دس روپیہ کا بہرہ بغیر ٹرائی کئے نہیں رکھتا پھر خصم کیسے کرلے بالکل اندھا بن کر۔
مہ لو۔ بقول آپ کے خصموں کی ٹرائی یورپ کو زیب دیتی ہے ہم اُس کے قائل نہیں۔
ریاض۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ہمارے پرانے طریقہ کی شادیاں کامیاب شادیاں ہوتی ہیں؟
مہ لو۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مغربی طریقے کی شادی کامیاب شادی ہوتی ہے؟
ریاض۔ بے شک!
مہ لو۔ شاید جناب کو معلوم نہیں کہ مغرب میں طلاقوں کی تعداد مشرق کی نسبت ہزار گنی زیادہ ہے۔ کیا یہ وہاں کے طریقۂ ازدواج کی ناکامیابی کا ثبوت نہیں؟
ریاض۔ پھر بھی بغیر ایک دوسرے کو جانے بوجھے ہمیشہ کے واسطے شریکِ زندگی بنا لینا ہماری تو سمجھ میں آتا نہیں۔
مہ لو۔ (ساڑھی سے کھیلتے ہوئے) بندہ نواز! انسان وہ پہیلی ہے جو سال چھ مہینے میں نہیں بوجھی جاسکتی۔ ع
کہ خبثِ نفس نہ گردد بسالہا معلوم

یہ باتیں ہورہی ہوتی ہیں کہ سامنے سے ایک دو لڑکیاں اور ایک دو لڑکے آتے ہیں۔
ایک لڑکا۔ میٹنگ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ گانا ہوگا۔
سعید۔ بھئی بہت خوب۔ بڑی معقول تجویز ہے شادی بیاہ تو ہو چکا۔ اب ذرا محفل بھی تو جم جائے۔ ہاں تو پھر شروع کردو۔ ریاض (دوسروں کی طرف مخاطب ہوکر) ہمارے دوست مسٹر ریاض ماشاء اللہ لحن داؤدی رکھتے ہیں۔
ریاض۔ اب تو میں بھول بھال گیا تقریباً دو سال سے یہ شغل چھٹا ہوا ہے۔
سعید۔ شروع بھی کرو۔ زیادہ باتیں نہ بناؤ۔
ریاض۔ اچھا ہم گاتے تو ہیں پر ایک شرط ہے۔
سعید۔ وہ بھی فرما دیجئے۔
ریاض۔ سب ہمارا ساتھ دیں اور نسبتی اشعار اپنی اپنی طبیعت کے مطابق لگاتے جائیں۔
سعید۔ او۔کے۔ O.K.
ریاض گانا شروع کرتا ہے۔
گانا۔ ایک ارج موری مان مان مان جا۔
ایک ارج موری مان۔
یارب آں سوز فگن در دلِ دیوانۂ ما

که خلیل آید و آتش برود از خانۂ ما

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

اگر زاہد دعائے خیری گوئی مرا این گو
کہ این آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

ایک ارج موری مان مان مان جا......

ریاض یہ اشعار رعنا کی طرف دیکھ کر پڑھتا ہے۔ پارٹی میں سے ایک نوجوان اپنے برابر والی لڑکی کی طرف خطاب کرکے گاتا ہے۔

نوجوان۔ نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں
دبائے بیٹھے دلِ بے قرار ہم بھی ہیں
ہمارے دستِ تمنا کی لاج بھی رکھنا
ترے فقیروں میں اے شہریار ہم بھی ہیں

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بہ ما کنند

ایک ارج موری مان مان مان جا۔ ایک ارج....

جس لڑکی کی طرف خطاب کرکے یہ شعر پڑھے گئے اس نے آخر میں سب کے جواب میں انگوٹھا دکھا دیا۔ اب نظریں رعنا کی طرف تھیں نسیم اور شمیم نے ٹہوکا۔ رعنا نے آنکھیں نیچی کئے کئے گانا شروع کیا۔

رعنا۔ شہر میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جاکے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

سوا تمہارے مچل کر کہیں نہ بہلے گا
بگاڑی خاطریں کر کر کے دل کی خو تم نے

آپ آجائیں تو شاید کہ قرار آجائے
دلِ بیتاب بہلتا نہیں بہلانے سے

ایک ارج موری مان مان مان جا۔ ایک عرض موری مان۔

اس دوران میں ریاض مہ نو کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا جاتا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ نظریں چار ہوتی ہیں۔ مہ نو نظریں چُرا جاتی ہے۔

سین (۱۴)

ریاض کا سٹنگ روم: ریاض ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ مہ نو کا تصور آنکھوں کے سامنے ہے۔ آہستہ آہستہ یہ شعر گا رہا ہے:۔

ریاض۔ آپ آجائیں تو شاید کہ قرار آجائے
دلِ بیتاب بہلتا نہیں بہلانے سے

روز باہر سے نوک کرتی ہے۔

ریاض۔ (اندر سے) کم ان۔ (Come in)

روز داخل ہوتی ہے۔ ریاض کھڑا ہو جاتا ہے۔

روز۔ (ایک کرسی پر بیٹھ کر) ہم کل ٹینس پر تمہارا انتظار کرتے رہے۔ صبح برک فسٹ پر بھی نہیں آئے۔

ریاض۔ ہاں میں کل اپنے دوست سعید کے ہاں چلا گیا تھا۔

روز۔ مس رعنا سے ملنے ؟

ریاض سگرٹ کیس پیش کرتا ہے۔ روز انکار کرتی ہے۔ وہ خود ایک سگرٹ نکالتا ہے اور سگرٹ کیس پر آہستہ آہستہ ٹھونکتا ہے۔ روز ریاض کی طرف بدمعاشی اور چالبازی کی نظروں سے دیکھتی ہے۔

روز۔ دیکھو ریاض۔ مجھ کو تمہارا رعنا کے پاس جانا پسند نہیں۔

ریاض۔ آپ کو میرے پرائیوٹ معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

روز۔ (غصہ کی آواز میں) حق نہیں ؟ تمہارے ہونے والے بچے کی ماں کو حق نہیں ؟

روز ہاتھوں سے منہ ڈھک کر بیٹھ جاتی ہے۔ ریاض ششدر رہ جاتا ہے۔ روز انگلیوں کی جھریوں میں سے جھانکتی ہے۔

سین (۱۵)

ڈرائنگ روم۔ صبح کا وقت۔ مرنو اخبار پڑھ رہی ہے۔ نسیم اور شمیم باتیں کر رہی ہیں۔

نسیم۔ (مرنو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شمیم سے) آج کل تو ریاض سے بڑی گاڑھی چھن رہی ہے۔ گھنٹوں باتیں ہوتی ہیں۔ خیر سے تخلیہ کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔

شمیم۔ یہ ایک بات ہے۔ مانا بات دماغ سے اُتار کر کرتی ہے۔ اس دن ریاض کو ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ وہ بھی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ایمان کی یہ ہے کہ ہماری مانا تیری جیسی سٹربلی باؤلی نہیں ہے۔

نسیم۔ اجی باؤلی ہوں یا ہشیار۔ اتنا ہم جتائے دیتے ہیں کہ وہ ولایتی ناگن ہے بڑی دُم گلی۔ اس کے آگے ان بیگم کی دال گلتی دکھائی نہیں دیتی۔

نوکر ایک ٹرے پر کارڈ پیش کرتا ہے۔

شمیم۔ (کارڈ دیکھ کر) بلاؤ۔

نوکر باہر جاتا ہے۔

نسیم۔ (مرنو سے) انسے بی اخبار کی شوقین وہ آرہے ہیں۔

ریاض داخل ہوتا ہے۔

شمیم۔ ماشاء اللہ آپ کی عمر تو بڑی ہے۔ ابھی ابھی آپ کا ہی ذکر خیر ہو رہا تھا۔

ریاض۔ (ایک کرسی پہ بیٹھتے ہوئے) ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔ میری عمر بڑی ہے۔ آپ کے نزدیک یہ اچھی بات ہوگی میں تو اس کو بُرا سمجھتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے دیس کی مت اوندھی کیوں ہے۔ دعا تک اللہ کی عنایت سے بے معنی ہے بتائیے بڑی عمر سے کیا فائدہ۔ اگر رنج وغم اندوہ والم میں گزرے۔ میں تو کہتا ہوں چھوٹی عمر بدرجہا بہتر ہے۔ بشرطیکہ خوش گوار ہو۔ دمے بے غمے بہتر از عالمے۔

مہ لقو۔ بندہ نواز۔ زندگی نام ہے افکار و حوادث کا ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ریاض۔ ؎

چکر میں رکھنا تھا تو بنانا تھا جام مے
انساں بنا کے کیوں مٹی خراب کی
غم ہم کو ایسا جو بنا یا نہ بنایا ہوتا۔

روز روز کے جھنجٹ۔ یہ گھڑی گھڑی کے غم۔ اس سے تو موت ہی بہتر۔

مہ لقو۔ موت کا ایک دن معیّن ہے۔ وہ تو وقت سے پہلے نہیں آسکتی۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہمارے انگریزی تعلیمیافتہ چھیلا اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مشکلیں ہمارے لئے ہیں اور ہم مشکلوں کو حل کرنے کے لئے۔ دنیا بھر کا بوجھ ہمارے واسطے پیدا کیا گیا ہے اور ہمارے شانے اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے۔ اشرف المخلوقات بننا آسان نہیں۔ انسان کی ذمہ داریاں۔ انسان کے رنج وغم خدا کی ہر مخلوق سے زیادہ ہیں اور زیادہ ہونے چاہئیں۔ ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

نسیم۔ معاف کیجئے گا ریاض صاحب! اس بلبل کو تو آپ سے جھک جھک کرنے کی پڑ گئی ہے عادت۔ بات یہ ہے کہ گھر پہ اکیلے پڑے پڑے اس کے دماغ کو زنگ لگ گیا تھا۔ اب ماشاء اللہ

قابل آدمیوں سے بات کرنے کا موقع ملا ہے تو
اس کو سان رکھ رہی ہے۔ ہم کو تو یہ بتائیے
کہ آپ ہیں ایک نسٹ کھا کر آئے ہیں یا نہیں؟

ریاض - نہیں ہیں آج ذرا پریشان ہوں مجھے
بھوک نہیں ہے۔

نسیم - دیکھئے ریاض صاحب! (مانا کی
طرف اشارہ کرکے) اس کا فلسفہ ہے کچھ اور۔ ہمارا
فلسفہ ہے دوسرا۔ یہ چہر نار تو تجریوں میں دل بھرتے
اور باتوں سے پیٹ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ معاف
کیجئے گا ریاض صاحب معاف کیجئے گا مرد پیٹ
کا کتا ہے اگر اس کا تندور پوری طرح بھر دیا جائے
تو اس کا غصہ، تشویش، فکر غرضکہ سب کچھ اگر ختم
نہیں ہو جاتا تو آدھا تو ضرور رہ جاتا ہے (مانا سے)
جانا بیٹھی منہ دیکھ رہی ہے۔ ریاض صاحب کے
لئے کچھ کھانے کا انتظام کر۔

مانا اٹھ کر جاتی ہے۔

ریاض - مجھے بھوک نہیں ہے۔

نسیم - بھوک تو کھانا دیکھ کر لگ آتی ہے۔

منو ابھی دروازہ تک پہنچی ہے۔ نسیم ذرا
پکار کر کہتی ہے۔

نسیم - اور دیکھو منو! ڈائننگ روم کا [illegible]

پھیلا ہو یہیں بھیج دے (ریاض سے) رعنا
گھرداری کا انتظام لاجواب کرتی ہے جس دن
سے یہ آئی ہے ہم تو باورچی خانہ کی طرف مڑ کر
بھی نہیں دیکھتے۔

ریاض - اچھا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ فقط باتیں
ہی بنانا جانتی ہیں۔

منو آتی ہے۔ پیچھے بہرہ ٹرے پر مختلف
کھانے کی چیزیں لئے آتا ہے۔ منو ایک
میز ریاض کے سامنے رکھ کر کھانے کی
چیزیں اس پر چن دیتی ہے۔

ریاض - آپ کیوں تکلیف کر رہی ہیں؟

نسیم - ہائے میں مرد نہ ہوئی۔

نسیم - یہ آخر آپ کو اس وقت اپنے مرد نہ ہونے
پر کیوں افسوس ہوا؟

نسیم - سچی ایمان سے کہتی ہوں جو میں مرد ہوتی تو
اس سندر ناری سے بیاہ رچاتی۔

منو - شکر ہے۔ خدا نے گنجے کو ناخن نہیں
دیئے۔

منو ریاض کے واسطے چائے بناتی ہے۔ نسیم
اٹھ کر بوئے کی لمبی شفٹ والی ٹوپی اتار
مانا کے سر پر رکھ دیتی ہے۔ مانا کے ہاتھ

گھرے ہوئے ہیں زبان سے کہتی ہے،۔

مہ لو۔ کیا کر رہی ہے باؤلی؟

(بوئے چلا جاتا ہے)

نسیم۔ آپ جانتے ہیں ریاض صاحب؟
اس چھوکری میں یہی تو لاکھ روپیہ کی بات ہے
گھرداری میں بھی طاق اور بحث کرنے میں بھی
کسی بیرسٹر سے کم نہیں۔

مہ لو کیتلی ہاتھ سے رکھ ٹوپی اتارنا چاہتی
ہے۔

نسیم۔ (ہاتھ روکتے ہوئے) تجھے ہمارے
سر کی قسم۔ ایمان سے بڑی پیاری لگ رہی ہے
رہنے دے۔ ہماری خاطر سے۔

(ذرا دور کھڑے ہو کر رانا کو سر سے پاؤں
تک دیکھ کر) بوئے!

مہ لو۔ (ایک خاص ادا سے) جی سرکار!

نسیم۔ اچھا ٹھہری رہ۔ چھوکری تو جاتی کہاں ہے
میں بھی ولایت جا کر مرد بن کر نہ آئی تو بات ہی
کیا ہے۔ (شمیم کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے) دیکھو
بوئے۔ صاحب کو کھانا ٹھیک طرح کھلاؤ۔
ہم ابھی آتا ہے۔

نسیم اور شمیم چلی جاتی ہیں۔ ان کے
جانے کے بعد مہ لو ٹوپی اتارنا چاہتی ہے

ریاض۔ (رانا کی طرف دیکھ کر) رہنے دیجئے
اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔
(رانا ٹوپی نہیں اتارتی) معاف کیجئے گا میں آپ کے
سامنے بے دھڑک اپنے جذبات کا اظہار
کر دیتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میں دوستوں میں
تکلف کا قائل نہیں۔

مہ لو۔ (آنکھیں نیچی کرکے رک رک کر) تو کیا آپ
مجھے دوست سمجھتے ہیں۔

ریاض۔ رعنا مجھے دوست کی ضرورت ہے
اور سخت ضرورت ہے۔ عنقا۔ گوگرد سرخ۔ پارس
اکسیر یہ سب ملتا ہے مگر دوست کم ملتا ہے۔
میں تو آپ کو دوست سمجھتا ہوں۔ اگر آپ۔

مہ لو۔ جب تک زندہ ہوں (ہاتھ آگے
بڑھاتی ہے۔ ریاض بھی ہاتھ ملاتا ہے) آپ کی
دوست رہوں گی۔

ریاض۔ تھینک یو رعنا! تھینک یو۔

شمیم اور نسیم ایک پردہ کے پیچھے سے
جھانک رہی ہیں۔

ریاض۔ (آنکھیں نیچی کیے ہوئے) دوست مجھے
آج آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے۔

مہ لو۔ فرمایئے۔

ریاض۔ غیر ملک کی عورت سے شادی کرنی آپ کی رائے میں کیسی ہے؟

مہ لو۔ دل سب کچھ کرواتا ہے۔ اس کے آگے عقل کی کچھ نہیں چلتی۔

ریاض۔ اگر دل کا سوال نہ ہو تو؟

مہ لو۔ اگر دل کا سوال ہو تو بھی غلطی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سخت حماقت ہے۔

ریاض۔ آپ اس کو حماقت کیوں کہتی ہیں؟

مہ لو۔ انتہائی دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات کا نام شادی یا ازدواج ہے۔ اور حاکم و محکوم آقا اور غلام میں دوستی ناممکن۔ اس وجہ سے میں ہندوستانی مرد کا یورپین عورت سے شادی کرنا محض حماقت شمار کرتی ہوں۔

ریاض۔ اور اگر مجبوری ہو تو؟

مہ لو۔ لفظ مجبوری مرد کے منہ سے نکلنا مرد کی توہین ہے۔

ریاض۔ اور اگر کچھ ذمہ داریاں ہوں تو۔

مہ لو۔ (ہونٹ بھینچ کر سانس کو قابو میں کرکے) ذمہ داریاں۔ ذمہ داریاں مرد ہمیشہ پوری کرتے ہیں۔

ریاض۔ (اٹھتے ہوئے) اچھا آپ سے یہی اجازت لینی تھی۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔

مہ لو۔ خدا حافظ۔

ریاض مہ لو کو سر سے پاؤں تک دیکھتا ہے۔
مہ لو نظریں نیچی کر لیتی ہے۔ ریاض ہاتھ بڑھاتا ہے۔ مہ لو ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتی ہے۔

ریاض۔ کاش میں اس ہاتھ کا اہل ثابت ہوتا۔ رعنا۔ ع

نہ جنت میرے قابل ہے نہ میں جنت کے قابل ہوں

مہ لو۔ (نظریں نیچی کئے ہوئے) یہ ہاتھ ایک دوست کے ہاتھ کی حیثیت سے ہمیشہ آپ کے واسطے حاضر ہے۔

ریاض۔ اچھا دوست خدا حافظ۔

ریاض باہر جاتا ہے۔ مہ لو کھڑکی میں سے دیکھتی رہتی ہے۔ پیچھے سے شمیم اور نسیم داخل ہوتی ہیں۔

نسیم۔ (شمیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) جب تک زندہ ہوں آپ کی دوست رہوں گی۔

مہ لو۔ ہاں دوست اور محض دوست

مہ لو ایک سوفے پر گر جاتی ہے۔ شمیم اور نسیم اس کے پاس بیٹھ جاتی ہیں۔

سین (۱۶)

ریاض کا سٹنگ روم۔ روز غصہ کی حالت میں کھڑی ہوئی ہے۔ ریاض ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔

روز۔ (غصہ سے) تم اس کے ذمہ دار ہو۔

ریاض۔ (غائبانہ انداز میں) میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ (رعنا کی تصویر اس حالت میں جب اس نے کہا تھا کہ "مرد ذمہ داریاں پوری کیا کرتے ہیں" ریاض کے سامنے آجاتی ہے) اور مرد ذمہ داریاں پوری کیا کرتے ہیں۔ (ریاض اٹھتا ہے سر پر ٹوپی رکھتا ہے) اچھا چلو میں اپنی ذمہ داری پوری کروں گا۔ (کونے میں سے بید اٹھاتا ہے) مرد ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں۔

روز۔ کہاں چلو گے؟

ریاض۔ میں ڈیرہ دون میں تم سے شادی کروں گا۔ یہاں نہیں۔

روز۔ ایک دم ٹھیک۔ That is a good boy.

روز ریاض کے شانے پر ہاتھ رکھتی ہے، پلاسٹر ہٹا دیتا ہے۔

سین (۱۷)

ریاض روز کے برابر بیٹھا دیوانہ وار موٹر چلا رہا ہے۔ کانوں میں آوازیں گونج رہی ہیں۔ رعنا کی شکل سامنے آتی ہے۔

آوازیں

آپ آجائیں تو شاید کہ قرار آجائے
دل بے تاب بہلتا نہیں بہلانے سے

یورپین عورت سے شادی کرنا محض حماقت ہے۔
شادی نام ہے انتہائی دوستانہ تعلقات کا۔
حاکم اور محکوم میں دوستی نہیں ہو سکتی۔

رعنا کی صورت شفق کی ٹوپی اوڑھے ہوئے نظر آتی ہے۔ دیوانہ وار دیکھتا ہے سامنے سے ایک اور موٹر آرہی ہے۔ روز چیخ مار کر اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ مارتی ہے۔ ریاض بچانے کی کوشش کرتا ہے موٹر اسکڈ کرتی ہے۔

دوسری موٹر والے موٹر روک کر پہلے ریاض کو نکالتے ہیں۔ اس کے کم چوٹیں ہیں۔ پھر سب مل کر روز کو نکالتے ہیں۔ روز سخت زخمی اور بے ہوش ہے۔ کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ باہر نکال کر جب زمین پر ڈالتے ہیں تو شانہ پر بچھو گدا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ نشان دیکھ کر ریاض دیوانوں کی طرح کہتا ہے:

ریاض۔ اُس ناگن کے دائیں شانے پر بچھو ہے۔ ہائے باپ۔

اتنا کہہ کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔

سین (۱۸)

بیڈ روم۔ صبح کا وقت۔ نسیم ایک ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال بنا رہی ہے۔ شمیم دوسری کے سامنے پوڈر لگا رہی ہے۔ مہ لو نہایت افسردہ خاطر کرسی پر بیٹھی ہوئی مسوری نیوز کی ورق گردانی کر رہی ہے اس خبر پر نظر پڑتی ہے۔

"A motor accidant"
Miss Rose & Mr. Riaz
Seriously injured.

مہ لو دیوانہ وار ٹیلیفون کی طرف بھاگتی ہے جلدی جلدی ڈائرکٹری کے ورق الٹتی ہے نسیم اور شمیم اس کے پاس آتی ہیں۔

شمیم۔ کیا بات ہے مانا۔

مہ لو۔ ایکسیڈنٹ۔ اخبار دیکھو۔ وہ زخمی ہو گئے۔

شمیم اور نسیم دوڑ کر اخبار دیکھتی ہیں۔ مہ لو نمبر ملاتی ہے۔

مہ لو۔ ہلو۔ any motor accidant case in your hospital ؟

بند کرتی ہے۔ دوسرا نمبر ملاتی ہے۔

مہ لو۔ ہلو۔ موٹر ایکسیڈنٹ کا کوئی کیس آپ کے ہاں آیا ہے؟ ایک مرد ایک عورت۔

بند کرتی ہے۔ تیسرا نمبر ملاتی ہے۔

مہ لو۔ ہلو۔ ڈاکٹر رحیم؟ موٹر ایکسیڈنٹ کا کوئی کیس آپ کے ہاں آیا ہے؟ ایک مرد ایک عورت .... ہاں ہاں مسٹر ریاض۔
(ٹیلیفون بند کر کے شمیم اور نسیم سے) ڈاکٹر رحیم کے ہاں ہیں۔ میں جا رہی ہوں۔

نسیم۔ (مہ لو کو روک کر) گھبراؤ نہیں ہم بھی چل رہے ہیں۔ باہر سلیپنگ سوٹ میں جاؤ گی؟ پاگل ہو رہی ہو۔

سین (۱۹)

صبح کا وقت۔ ڈاکٹر رحیم کا نرسنگ ہوم
ایک کمرہ میں بیڈ پر روز مردہ پڑی ہے۔ ڈاکٹر منہ پر کپڑا ڈھک دیتا ہے۔ باہر آتا ہے تو مہ لو نسیم اور شمیم سے ملاقات ہوتی ہے۔

نسیم۔ (گھبرائے ہوئے انداز میں) کیا حال ہے؟

ڈاکٹر کچھ اس طرح گردن ہلاتا ہے جس کے معنی ہیں کہ مریض ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر کا یہ اشارہ دیکھ کر مہ لو لڑکھڑاتی ہے شمیم سہارا دیتی ہے۔

ڈاکٹر۔ مس روز کی تو شروع ہی سے کوئی امید نہ تھی۔

نسیم ۔ (جلدی سے) اور مسٹر ریاض؟

ڈاکٹر ۔ وہ بہتر ہیں ۔

مہ لو یہ فقرہ سنکر سنبھل جاتی ہے ۔

شمیم ۔ ہم لوگ ان کو دیکھ سکتے ہیں؟

ڈاکٹر ۔ بے شک ۔

دو قدم ڈاکٹر ان کے ساتھ جاتا ہے۔ ایک دروازہ کھول دیتا ہے ۔ یہ تینوں اندر جاتی ہیں۔ ایک بیڈ پر ریاض پڑا ہے ۔ مختلف جگہ پٹیاں بندھی ہیں ۔ ان کو دیکھ کر ریاض ذرا کبیدہ خاطر ہوتا ہے ۔

ریاض ۔ ڈاکٹر کی اجازت نہیں ہے کہ مرے پاس کوئی آئے ۔

نسیم ۔ ہم ڈاکٹر کی اجازت سے آئے ہیں ۔

ریاض ۔ ڈاکٹر کی اجازت سے آئے ہیں۔ آپ نے خدا کی بھی اجازت لی یا نہیں .... مہ لو کی طرف دیکھ کر) خدا کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی شریف آدمی میرے پاس آئے ...... جاؤ۔ رعنا جاؤ ۔ مجھ سے دور چلی جاؤ ۔ میں گناہگار ہوں ۔ میں تمہارے قابل نہیں رہا ۔

ریاض اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیتا ہے ۔

مہ لو ۔ یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟ میں تو آپ کو دوست سمجھتی ہوں ۔ گناہگار نہیں ۔

ریاض ۔ (منہ ڈھکے ڈھکے) رعنا میں تمہاری دوستی کے قابل نہیں ۔ میں گنہگار ہوں ، سخت گنہگار ۔

مہ لو ۔ مجھے یار کی یاری سے کام ہے فعلوں سے کام نہیں ۔ آپ گنہگار ہیں تو ہوا کریں ۔ میں تو آپ کو دوست سمجھتی ہوں ۔ آپ نے مجھ سے دوستی کا عہد کیا تھا ۔ آپ نے مجھ سے دوستی کا بندھن باندھا تھا کیا اسکو توڑ دیں گے؟

ریاض ۔ رعنا تو سمجھتی نہیں ۔ دنیا کو جانتی نہیں ۔ اس عہد شکن دنیا کے نزدیک بڑے سے بڑا عہد توڑ دینا ایسا ہی ہے جیسا بچّے کے لئے ایک کھلونا توڑ دینا ۔ میری زندگی کا بندھن ٹوٹ گیا میری خاندانی شرافت کا شیرازہ بکھر گیا میری دنیا میں دوستی کے عہد و پیمان ختم ہو چکے ۔ دوستی! دوستی نیکوں کی دنیا کا لفظ ہے ۔ اور اس دنیا کا دروازہ میرے لئے بند ہو گیا ۔ رعنا ۔ اب دوستی بھی ختم ہو چکی اور دشمنی بھی ۔ دُنیا نے میرے ساتھ چال کی ۔ رعنا ۔ دنیا نے مجھے دھوکا دیا ۔ میں دُنیا کو فریب دوں گا ۔ دُنیا والوں کو

فریب دوں گا۔ پر رعنا۔ میں تجھے دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ میری سیاہ کاری کی اندھیری دنیا میں نیکی کا یہی ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے۔ اسے رہنے دے۔ پر مجھ سے دور۔ میرے گناہ کے طوفانی تھپیڑوں سے دور۔ بہت دور۔ کہیں اس گناہ کے اندھیاؤ میں بجھ جائے۔ کہیں مجھ گنہگار کا یہ آخری آسرا بھی لوٹ نہ جائے رعنا تو نہیں جانتی۔ میں نے گناہ کیا ہے۔ بہت بڑا گناہ۔

رعنا۔ آخر وہ ایسا گناہ کیا ہے؟

ریاض۔ نہ پوچھ۔ نہ پوچھ۔ میں بتا کر تیری نظروں میں ہمیشہ کے لئے ذلیل ہونا نہیں چاہتا رعنا۔ جا مجھ سے دور چلی جا۔ بہت دور۔ کہیں تیرا معصوم گلاب سا چہرہ میرے سانس سے مرجھا نہ جائے۔ رعنا تو نہیں جانتی کہ میں کس دل سے تجھے یہ کہہ رہا ہوں۔ پر تیرے بھلے کو کہہ رہا ہوں۔ جا مجھے بھول جا سمجھ کہ ریاض بھی ایکسیڈنٹ میں مر گیا۔

ریاض منہ ڈھک کر کروٹ لے لیتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور ڈاکٹر آتا ہے۔ شمیم اور مہ لقو [illegible] کے لئے باہر نکلتی ہیں۔

سین (۳۰)

چاندنی رات ہے۔ نسیم شمیم اور مہ لقو ٹہلتی چلی جا رہی ہیں۔

نسیم۔ سُنا ہے مسٹر ریاض ہسپتال سے آ گئے ہیں۔

شمیم۔ ہاں۔

نسیم۔ ہمارے گھر نہیں آئے؟

شمیم۔ نہیں۔

مہ لقو۔ ہیں تو بالکل تندرست؟

شمیم۔ ہاں بھائی کہتے تھے بالکل ٹھیک ہیں۔

ایک طرف سے گانے کی آواز آتی ہے۔

آواز

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیئے

یہ سب آگے بڑھتی ہیں تو ایک چٹان پر ریاض بیٹھا نظر آتا ہے۔ قریب بوتل رکھی ہے۔ منہ لگا کر پیتا جاتا ہے اور گاتا جاتا ہے۔ [illegible] اس کو دیکھ کر ایک درخت کے پیچھے چھپ جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد

نسیم۔ مانا۔ تم جاؤ۔
مہ لو۔ کیا فائدہ ؟
شمیم۔ جاؤ تو سہی۔
مہ لو۔ (جاتے ہوئے) ـــہ

پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

مہ لو چپکے چپکے ریاض کے پہلو میں جا کھڑی ہوتی ہے۔ ریاض کی نظر پہلے مہ لو کے پاؤں پر پڑتی ہے۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو مہ لو کھڑی ہے۔ چہرہ پر ایک مسکراہٹ آتی ہے پھر سنجیدہ اور غمگین سا ہو جاتا ہے۔

ریاض۔ تم میرے پاس کیوں آئی ہو؟
مہ لو۔ (سر جھکائے ہوئے) کیوں آئی ہوں۔ کیا مجھے آپ کے پاس آنے کی بھی اجازت نہیں ؟
ریاض۔ کسی شریف لڑکی کو مجھ گنہگار کے پاس آنے کی اجازت نہیں۔ جاؤ میرے پاس سے۔
مہ لو۔ ریاض۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اس کا ایفا تم پر فرض ہے۔
ریاض۔ وعدہ کرنا انسان کے بس میں ہے اس کا ایفا اس کے قابو سے باہر (عجیب انداز سے ہنس کر) میں نے اپنے باپ سے وعدہ کیا تھا اور پورا بھی کیا۔ پر عجیب انداز سے میرے وعدوں کا ایفا نرالے ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ ڈرو۔ ڈرو میرے وعدوں سے اور ان کے ایفا سے۔ بھاگو بھاگو مجھ سے اور میرے گناہوں سے۔ جاؤ جاؤ رعنا میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ ع

نہ جنت میرے قابل ہے نہ میں جنت کے قابل ہوں

مہ لو کھڑی رہتی ہے۔ ریاض اپنی بوتل اُٹھا لڑکھڑاتا گاتا چلا جاتا ہے۔

ریاض۔ ـــہ

در کوئے نیکنامی مارا گزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

مہ لو سر جھکائے شمیم اور نسیم کے پاس آتی ہے۔

نسیم۔ کیا باتیں ہوئیں ؟
مہ لو۔ ـــہ

کیا بلا غرض مدعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے

میں نے سوچا تھا کہ ان کی دوست بنکر زندگی گزار دوں گی لیکن قسمت کو یہ بھی منظور نہیں۔

خیر مرضیٔ مولےٰ از ہمہ اولےٰ۔ گھر کے جلے بن میں گئے۔ بن میں لگی آگ۔ بن بیچارا کیا کرے تیرے تن میں لگی آگ۔

قسمت میں جو لکھا ہے مٹایا نہ جائیگا
بگڑا ہوا نصیب بنایا نہ جائے گا

تینوں سر جھکائے چلی جاتی ہیں۔

سین (۲۱)

ایک بہت بڑا بال روم ہے۔ ریاض ایک میز پہ اکیلا بیٹھا پی رہا ہے۔ سامنے سے لوگ فینسی ڈریس پہنے آتے ہیں۔ ایک عورت شفق کے کپڑے پہنے لمبی ٹوپی اوڑھے آتی ہے۔ ریاض کی نظروں میں مہ لقا کی صورت پھر جاتی ہے۔ جب اس نے شمیم کے ہاں اس کے آگے میز لگائی تھی اور نسیم نے شفق کی ٹوپی اس کو پہنا دی تھی۔ پھر وہ منظر سامنے آتا ہے جب وہ ٹوپی اتار رہی ہے اور یہ کہتا ہے "رہنے دو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔"

ریاض۔ بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

یہ کہتا ہوا وہاں سے بھاگتا ہے۔ ریاض بھاگتا چلا جاتا ہے اور بار بار یہی فقرہ کہتا ہے:-

"بہت اچھی لگتی ہے۔ بہت اچھی لگتی ہے"

راستہ میں مہ لقا کی کوٹھی آتی ہے۔ اس کے قریب تک جاتا ہے اور پھر وہاں سے بھاگتا ہے۔ آخر کو اسی طرح بھاگتا رکتا ایک طوائف کے گھر پہنچتا ہے۔

سین (۲۲)

طوائف کا گھر۔ ریاض دیوانہ وار پہنچتا ہے۔ طوائف اٹھ کر سلام کرتی ہے ریاض گاؤ تکیہ کے آگے نشہ میں دھت گر جاتا ہے۔

ریاض۔ (سو کا نوٹ نوکر کے آگے پھینکتے ہوئے) بوتل لاؤ۔ جلدی کرو۔ بہت اچھی لگتی ہو۔

اس فقرے پہ طوائف ایک خاص ادا سے مسکراتی ہے۔

ریاض۔ (طوائف کی مسکراہٹ کو پہچان کر) تم نہیں کوئی اور کچھ سناؤ۔

استاد ساز ملاتے ہیں۔ طوائف گانا شروع کرتی ہے:-

گانا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا،
اور درویش کی صدا کیا ہے

گانے کے دوران میں بوتل آجاتی ہے اور ریاض شغل شروع کر دیتا ہے۔ جب طوائف یہ ختم کرتی ہے تو ا۔

ریاض۔ (ایک نوٹ دیتے ہوئے) اور کچھ گاؤ۔

طوائف۔ جو حکم۔

ریاض۔ (طوائف سے) ادھر آؤ۔ (گلاس دیتے ہوئے) پیتی جاؤ۔ گاتی جاؤ۔

طوائف۔ (ذرا انکار کے انداز میں) حضور...............

ریاض۔ (سو کا نوٹ دے کر) تمہارا حضور یہ ہے۔

اُستاد۔ کیوں انکار کرتی ہے حضور سے۔ شرم نہیں آتی؟

ریاض ایک خاص انداز سے مسکراتا ہے۔ طوائف کو اپنے پاس بٹھا لیتا ہے۔ وہ پی کر گانا شروع کرتی ہے۔

طوائف:۔ گانا

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے
جھک کے کچھ بات کہی شیشہ نے پیمانے سے

ریاض:۔

مست کر دیتی ہے پہلے ہی نگاہِ ساقی
آنکھ کے سامنے چلتی نہیں پیمانے کی

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے
جھک کے یہ بات کہی شیشہ نے پیمانے سے

با صد کرشمہ آں بت بدمست می رود
خود می کند خرام و خود از دست می رود

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے
جھک کے یہ بات کہی شیشہ نے پیمانے سے

طوائف:۔

فائدہ کیا ہے تجھے بزم میں جل جانے سے
شمع نے یہ کبھی نہ پوچھا کبھی پروانے سے

ریاض:۔

پروانہ نیک رفت کہ در پیش شمع سوخت
آن گر نہ شد کہ سوختن غائبانہ چیست
جل گیا شمع کے آگے ہوا انجام بخیر

سوز فرقت سے نہ آگاہ ہوا پروانہ
شمع نے یہ بھی نہ پوچھا کبھی پروانے سے

طوائف:۔
تم نے دیکھی بھی ہے اُس شوخ کی مستی بھری آنکھ
بلتی جُلتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانے سے

ریاض:۔
مے می چکد از چشمش جانا نہ چنیں باید
از گردشِ خود مست است پیمانہ چنیں باید
تم نے دیکھی بھی ہے.....
ہماری تو بس اب اے شیخ اتنی بادہ نوشی ہو
نشیلی انکھڑیوں کو دیکھنا مخمور ہو جانا
تم نے دیکھی بھی ہے.....

طوائف:۔
آپ آ جائیں تو شاید کہ قرار آ جائے
دلِ بے تاب بہلتا نہیں بہلانے سے
اس شعر پر ریاض دیوانہ وار کہتا ہے:۔

ریاض:۔ مت گاؤ۔ یہ مت گاؤ۔
دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھک لیتا ہے۔ اور تکیہ پہ سر ٹیک دیتا ہے۔

سین (۲۳)

صبح کا وقت ہے۔ مرنو کاسمٹی فول پہ ٹہل رہی ہے۔ ریاض اور رات والی طوائف رکشا میں بیٹھے کاسمٹی فول کی طرف جا رہے ہیں۔

رکشا والا۔ (رکشا روک کر) یہ ہے کاسمٹی فول حضور!

مرنو ان دونوں کو دیکھ کر درختوں میں چھپ جاتی ہے۔ یہ دونوں اتر جاتے ہیں۔ ریاض کے ہاتھ میں بوتل ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے اس درخت کی طرف جا نکلتے ہیں جس کے نیچے مرنو بیٹھی تھی۔ ریاض کے سامنے مرنو کی تصویر پھر جاتی ہے۔ اتنے میں طوائف اس درخت کے نیچے جا بیٹھتی ہے۔ اب جو ریاض ادھر دیکھتا ہے تو مرنو کی جگہ طوائف نظر آتی ہے۔ اس کو دیکھ کر سخت غصہ آتا ہے۔

ریاض۔ (طوائف کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اٹھاتے ہوئے) جاؤ جاؤ۔ یہ جگہ تمہارے قابل نہیں ہے (اس کو رکشا کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اس میں بٹھا کر رکشا والے کو دس کا نوٹ دے کر) لیجاؤ۔ جہاں سے لائے تھے وہاں پہنچا دو۔

اس کے چلے جانے کے بعد ہنستا ہے اور اپنی
بوتل لے درخت سے تھوڑی دور ایک چٹان
پر درخت کی طرف پیٹھ کر ہو بیٹھتا ہے۔ پینی
شروع کر دیتا ہے اور گاتا جاتا ہے۔

ہمشارۂ قلندر سزدار بمن نمائی
کہ دراز و دور بینم رہ و رسم پارسائی

محفلِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں۔۔۔صنما۔۔۔

تو پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی۔۔۔صنما۔۔۔

اس دوران میں مہ نو درختوں کے پیچھے سے
نکل کر اسی درخت کی جڑ میں آن بیٹھتی ہے۔

ریاض:۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے میکنم با خلق عالم کار نیست

خدا پرست مرا بت پرست می گوید
خداش خیر دہد آنچہ ہست می گوید۔۔۔صنما۔۔۔

چہ غم ز بے کلہی کاسماں کلاہِ من است
زمیں بساط و در دوست بارگاہِ من است

گدائے عشقم و سلطانِ وقتِ خویشتنم
نیاز و مسکنت و عجز و غم سپاہِ من است

قلندرانہ گنہ می کنم ندارم باک
از آنکہ رحمتِ حق عاشقِ گناہِ من است۔۔۔صنما۔۔۔

ہنکارو آج خوب چلو میکدہ کو ذوق
چھوڑو کہیں وظیفہ بہت پڑ پڑا چکے۔۔۔صنما۔۔۔

ریاض گا کر خاموش بیٹھ جاتا ہے۔ اور بوتل
منہ سے لگا لیتا ہے:۔

ریاض۔ (نشہ میں دھت) رعنا۔ رعنا۔ میں نے تجھ کو اپنے پاس سے جھڑک کر نکالا تھا۔ کاش میں تجھ سے معافی مانگ سکتا۔ رنڈی تو جہاں بیٹھی تھی وہاں جا بیٹھی۔ ہم نے اس کو نکال دیا۔ وہ خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ ہم آنکھوں سے لگائیں گے۔ (اٹھتا ہے) ہم آنکھوں سے لگائیں گے۔

درخت کی طرف بھاگا ہوا جاتا ہے۔ سامنے
مہ نو نظر پڑتی ہے۔ وہ ہاتھوں سے منہ ڈھکے
بیٹھی رو رہی ہے۔ یہ ذرا جھجکتا ہے پھر دوڑ کر
اس کے پاؤں پر گر جاتا ہے۔

ریاض۔ (گڑگڑا گڑگڑا کر) معاف کر دے رعنا۔ مجھے معاف کر دے۔

رعنا چپ بیٹھی محبت بھری نظروں سے
اس کو دیکھتی رہتی ہے۔

رعنا۔ چاہتا تھا کہ ایک بار تجھ سے معافی مانگ لوں

میں نے اس دن بدتمیزی کی تھی۔ شرمسار ہوں۔ مجھے معاف کر دے رعنا میں تیرے قابل نہیں ہوں اس لئے تجھ سے دور بھاگتا ہوں۔ میں تیرے بھلے کو تجھ سے دور بھاگتا ہوں۔

اتنا کہہ کر اٹھنا چاہتا ہے۔ مہ نو دامن پکڑ لیتی ہے۔ ریاض مڑ کر دیکھتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے۔

ریاض۔ (رعنا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر) رعنا میں اس ہاتھ کے قابل نہیں رہا۔

مہ نو۔ (آنکھیں نیچی کئے ہوئے) یہ ہاتھ تو تقریباً چار سال ہوئے آپ کا ہو چکا۔

ریاض۔ کیونکر؟

مہ نو۔ پنچوں کا کیا۔ بڑے بوڑھوں کا کیا۔ بزرگوں کا کیا۔

ریاض۔ مطلب؟

مہ نو۔ مطلب یہ کہ میرا نام رعنا نہیں مہ نو ہے۔

ریاض۔ (سوچ کے انداز میں) مہ نو۔

مہ نو۔ جی ہاں مہ نو۔ آپ کی...... کنیز آپ کی لونڈی۔

ریاض۔ (سوچ کر۔ چہرہ پر بشاشی کے آثار ہیں) میری منگیتر؟

مہ نو کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتی ہیں اور وہ محجوبانہ انداز میں سر جھکا لیتی ہے۔ ریاض مہ نو کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر اس کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے:۔

ریاض۔ مہ نو! میں گنہگار ہوں۔

مہ نو۔ کچھ بھی سہی۔ آپ میرے لئے تو دیوتا ہیں مجازی خدا ہیں۔

ریاض۔ کیا تم مجھ سے کبھی میرے گناہ کی بابت نہیں پوچھو گی؟

مہ نو۔ مجھے کیا حق ہے؟

ریاض۔ حق تو ہے پر پوچھنا نہیں۔

مہ نو۔ (مسکرا کر) اونہوں۔

ریاض مہ نو کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتا ہے۔ دونوں گاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

گانا۔ مل گیو رے مورا سنگ سنگا تی۔ مل گیو رے مورا سنگ سنگا تی۔

مل گیو رے......

راستہ میں ریاض کی بوتل پڑی ہے وہ ٹھوکر مارتا چلا جاتا ہے۔

آغاز و انجامِ عیش

کل شب شبِ نشاط تھی احباب جمع تھے
عیش و طرب کا نقشہ تھا ہر سو جما ہوا

ساقی تھا مے تھی بادہ و مینا کا دور تھا
پھولوں کا فرش چار طرف تھا بچھا ہوا

معشوق مستِ ناز تھے عاشق نیاز کیش
ناز و نیاز کا تھا فسانہ چھڑا ہوا

ہر مہ جبین رشکِ قمر تھا خدا گواہ
اِندر کا سا اکھاڑا تھا ہر سو جما ہوا

سیلی شکم پہ سیلِ طرب کا پیام تھی
گردابِ ناف اور بھی چکر پڑا ہوا

سینہ پہ مے فروش کے معکوس جام تھے
یا مستی و شباب کا دریا چڑھا ہوا

یا بلبلے تھے قلزمِ عیش و نشاط کے
یا عشق دیوتا کا تھا خیمہ گڑا ہوا

آوازِ نائے و نوش تھی ہر سمت سے بلند
لاتقنطوا زبانوں پہ سب کی چڑھا ہوا

تھا شربتِ وصال کا ہر مست جرعہ کش
عنابِ لب کوئی تھا کہیں چوستا ہوا

انگیا کا ہوش تھا نہ دوپٹہ کا ہوش تھا
دامن حیا کا ہاتھ سے ان کے چھٹا ہوا

معشوق محوِ ناز تھے مست شراب تھے
اور کچھ جوانیوں کا نشہ تھا گھٹا ہوا

دستِ نگار و دستِ طلب ایک تھے وہاں
گردن میں ایک اسکی اک اس کی پڑا ہوا

فانوس میں تھی شمع کہ پردے میں شعلہ رو
یا نورِ طور تھا نہ داماں چھپا ہوا

آواز گھنگروؤں کی سرِ چرخ جاتی تھی
زُہرا کا رنگ آج تھا پھیکا پڑا ہوا

نوخیز مست ناز طرحدار بادہ کش
ہر عضوِ جسم سانچے میں اس کا ڈھلا ہوا

مصروفِ رقص صرفِ ادا محوِ ناز تھی
تھا اس کی ٹھوکروں میں زمانہ پڑا ہوا

لغزیدہ یا اداؤں میں وہ مستیاں گھلی … آتا تھا زہد وہاں پہ مگر کانپتا ہوا
وہ شب شب برات تھی ہر سمت عیش تھا … اور صبح ہوتے کیا کہوں محفل میں کیا ہوا
فانوس میں تھی شمع کفن میں ہو جیسے نعش … آنسو جمے تھے چہرہ پہ سر تھا جھکا ہوا
بیوہ کی طرح سر سے قدم تک سفید پوش … ماتھے پہ ایک کالا سا ٹیکہ لگا ہوا
محفل کی صبح ہوتے ہی حالت یہ ہوگئی … جیسے کتاب عیش کا صفحہ پھٹا ہوا
شب کو بہار عشق تھی اور جشن عیش تھا … صبح تھا زہر عشق کا دفتر کھلا ہوا
محفل خموش صدر میں اک گاؤ تکیہ تھا … جیسے ہو گھر میں کوئی جنازہ پڑا ہوا
سینہ پہ داغِ محفل دوشیں لئے ہوئے … تھا ایک سمت بزم میں طبلہ پڑا ہوا
سامانِ عیش بکھرے پڑے تھے زمین پر … یا دست مست سے کوئی ساغر چھٹا ہوا
چہرہ کے گرد زلف تھی معشوق محو خواب … جس طرح غم میں عیش کا لشکر گھرا ہوا
کنگھے پڑے تھے بزم میں پران کا تھا یہ حال … جیسے غزل کی بحر میں نوحہ لکھا ہوا

محفل سجی سجائی تھی لیکن اُداس اُداس
اک رات کی دلہن پہ رنڈاپا چڑھا ہوا

اسی مُصنّف کی دیگر تصانیف

دلی کا سنبھالا .... عہ — چند افسانے .... سہ عہ
ہم اور وہ .... عہ — ناکام .... عہ
میلاد شریف .... سہ — شرح درد ۸عہ

پتہ :- اُردو مجلس پبلشرز مٹیا محل دہلی

تعداد ۵۰۰

نومبر سنہ ۱۹۴۴ء

مطبوعہ جناح پریس لال کنواں دہلی

Date	No.	Date	No.